باب چہارم

۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک کی نمائندہ خودنوشتوں میں نفسیاتی کشمکش

''سلسلۂ روز وشب''(۱۹۸۴ء) صالحہ عابد حسین

''سلسلۂ روز وشب'' اُردو کی مشہور فکشن نگار اور ادیبہ بیگم صالحہ عابد حسین کی خودنوشت ہے۔ اسے پہلی بار مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا گیا۔ صالحہ اسکے علاوہ بہت ساری کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ یہ خودنوشت انکی طویل سفرِ حیات کی کہانی ہے۔ اس میں انکی زندگی کے نشیب وفراز سے بھر پور واقعات کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ یہ آپ بیتی صرف حالات وواقعات کی خشک کھتونی نہیں بلکہ اس سے انکی زندگی کے ساتھ ساتھ ادب اور ماحول سے جڑے اہم محرکات کی گرہ کشائی ملتی ہے۔ انہوں نے جس دلکش پیرائے اور سادہ اسلوب میں اسے تحریر کیا ہے اور جزئیات نگاری وکردار سازی کا جو رنگ اس میں بھرا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسے دیکھ کر بعض موقعوں پر ناول کا سا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس میں جہاں ناول کی طرح کا ایک تسلسل ملتا ہے وہیں فکشن نگاری کا بھی ایسا جوہر محسوس ہوتا ہے کہ انکی قدرالکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انکے تعارف کے حوالے سے یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ مولانا الطاف حسین حالی کی نواسی، خواجہ غلام الثقلین کی دختر، خواجہ غلام السیدین کی ہمشیر اور ڈاکٹر عابد حسین کی اہلیہ ہیں۔

صالحہ عابد کی یہ خودنوشت پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اسے لکھنے کی شروعات سن باون میں ہی ہوئی تھی لیکن چند وجوہ کی بنا پر دوبارہ اسے اسّی کی دہائی میں لکھنا شروع کیا گیا۔ ان پچیس ابواب میں انکی نجی زندگی، انکے خاندان کے افراد اور اس ماحول پر تفصیلی طور پر خامہ کشی ملتی ہے۔ اسے تحریر کرتے وقت اکثر مقامات پر خودنوشت نگار جذباتی بھی ہو جاتی ہیں جو انکے شدید حساس ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بیگم صالحہ کی تمام تر ادبی سرگرمیاں ان کے خاندان کے علمی جوش وخروش کی رہین منت ہیں۔ اس

ضمن میں سب سے اہم رول انکے شوہر کا قرار دیا جاسکتا ہے،جنکی صحبت و رفاقت نے نہ صرف انکی معلومات میں ازحد اضافہ کیا بلکہ انہیں آگے تعلیم حاصل کرنے میں بھی ہمت افزائی کی۔ یہ خودنوشت بھی انکی تحریک وترغیب کا نتیجہ ہے۔اس آپ بیتی کے آغاز میں کتاب کی صداقت ومعیار اور مصنفہ کا خود کی شخصیت پر کیا گیا جو تبصرہ ملتا ہے وہ خودنوشت اور خودنوشت نگار کے بارے میں اہم رائے قائم کرنے میں مدد دیتا ہے اس لیے اس تبصرہ کو یہاں درج کرنا خالی از نفع نہ ہوگا:

> ''سلسلۂ روز وشب ایک سیدھی سادی سوانح عمری ہے،ایک ویسی ہی سیدھی اور بے بناوٹ شخصیت کی، میں نے اپنے امکان بھر نہایت صداقت اور صفائی سے اپنے حالات،خیالات اور زندگی پیش کردی ہے۔حتی المقدور مبالغہ،تعلّی،غلط بیانی وغیرہ سے کہیں کام نہیں لیا۔ دوسروں کے تذکرے میں بھی،میرا مشاہدہ،اوران کے بارے میں میرے خیالات اور تجربات نظر آئیں گے۔جہاں اپناذکر ہے وہاں حقیقتوں کا اظہار ہے اور جہاں اپنے فن کے بارے میں لکھا ہے وہ ظاہر ہے میری اپنی رائے ہے۔دوسروں کا اس بارے میں کیا خیال ہے یہ میں نہیں کہہ سکتی۔بہرصورت میں نے اس کی حد بھر کوشش کی ہے کہ فریب داستان اور مبالغہ نہ ہو۔بیجا انکسار سے بھی کام نہیں لیا ہے۔''(۱)

صالحہ عابد کا ادب اور بلخصوص یہ خودنوشت کسی الہام کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ انکے گہرے لاشعور کا آئینہ دار ہے۔اس کے پس پردہ ان کا فلسفہ حیات کارفرما ہے۔انکے تجربات وحدثات کا ایک طویل سلسلہ کھڑا ہے۔ان کی تربیت و ماحول کا اثر ہے۔ان عناصر نے جس طرح کی شخصیت پروان چڑھائی،اسی کا آئینہ دار انکا ادب ہے۔ان کی تحریر میں جو زندگی کی حقیقی تصویر،اخوت ومحبت ،سماجی اصلاح اور ملک کی تہذیبی اقدار سے وابستگی کا درس ملتا ہے وہ ان ہی تجربات و ماحول کی دین ہے۔مصنفہ مہاتما گاندھی، ابوالکلام آزاد،الطاف حسین حالی،علامہ اقبال اور اپنے خاندان کی دیگر شخصیتوں سے بہت متاثر تھیں۔ انکے لئے گاندھی جی بچپن میں ایک مافوق الفطرت اور روحانی شخصیت تھی۔آبائی عقائد ونظریات کے بسبب وہ حضرت علی اور اہل بیت اطہار سے بھی بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔وہ خودنوشت میں اپنے حسب و نسب پر بھی بہت نازاں دکھائی دیتی ہیں کیونکہ اُنکا سلسلہ نسب ایک صحابی رسول،حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جاملتا ہے۔ان اُمور کا ایسا نفسیاتی اور لاشعوری اثر ان پر پڑا کہ انکا ادب مثالی معاشرہ اور کرداروں کا

مظہر بنا اور جنسی کج روی سے بھی محفوظ رہا۔ وہ خود نوشت میں خود اپنی ذہنی اور شخصی تشکیل کے پیچھے ان اسباب کا ہاتھ مانتی ہیں اور اس بارے میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''قدرت نے مجھے ایسے خاندان میں پیدا کیا جس پر میں جتنا بھی فخر کروں، بجا ہے، لیکن اس سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ مجھے ان بزرگوں کی صفات اور خوبیوں کا احساس دیا۔ شاید غیر شعوری طور پر مجھ میں بچپن سے یہ لگن رہی ہو کہ میں کم سے کم ننگ خاندان نہ بنوں۔''
>
> (۲)

ماحولہ اقتباس اس حقیقت کا غماز ہے کہ انکا مقصد حیات لاشعوری طور پر انکے ادب میں پنہاں ہو گیا ہے۔ اس حوالے سے انکے ادب پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس میں جنس و رومان کا عکس دکھائی نہیں دیتا، کہانیوں میں حزنیہ رنگ ملتا ہے اور اداسی کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ اس کے پیچھے بھی تجربات و حادثات کے طویل سلسلوں کا ہاتھ ہے اور انکا گہرا لاشعور کارفرما ہے۔ مصنفہ کے مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بخوبی نظر آتا ہے کہ ان کے لاشعور میں فوق انا کا شدید دباؤ ہے جس سے وہ تاعمر نکل نہیں پائیں۔ اس نفسیاتی کشمکش کو مزید ذیل کے سطور میں بھی واضح طور سے محسوس کیا جاسکتا ہے جہاں وہ خود پر لگے الزام کی صفائی پیش کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ انکے اسلوب و مضوعات کے انتخاب کے حقیقی باعث اور ذہنی کشمکش کو بھی اُجاگر کرتا ہے:

> ''میرے ناولوں اور کہانیوں پر ایک اعتراض یہ ہے (اور بہت ہی قسم کے لوگوں کی طرف سے) کہ وہ ''خشک'' ہوتے ہیں۔ ''رنگین'' نہیں ہوتے بعض کہتے ہیں کہ اس میں رومان نہیں ہوتا۔ بعض کا خیال ہے کہ ''عشق'' نہیں ہے اور یہ اعتراض تو ہے ہی کہ سیکس یا جنس کا بیان نہیں کرتی۔ کترا کر نکل جاتی ہوں...... میں نے اس مسئلے پر اکثر سوچا ہے، غور کیا ہے۔ میری ایک دوست نے ایک بار کہا تھا چونکہ اس نے ''عشق'' نہیں کیا اس لیے وہ اچھا ناول نہیں لکھ سکتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میں خالص عشقیہ کہانیاں بھی لکھ سکتی ہوں اور سستی شہرت اور قاری کے ''مزوں'' کے لیے (یا گمراہ کرنے کے لیے؟) کہانی میں سیکس بھی ڈال سکتی ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ میرے کچھ اصول ہیں۔ وقتی اور سستی شہرت مجھے اپنی بے عزتی معلوم ہوتی ہے اور محض بکنے کے لیے میں نے کبھی کچھ لکھا ہی نہیں۔ میرا فن جب تک مجھے مطمئن نہ کرے تب تک وہ شائع نہیں ہوگا...... کسی لڑکی یا لڑکے یا مرد و عورت میں ایک

جھلک، ایک نظر، آواز، (گفتار یا رفتار) سے جو ''طوفانی عشق'' پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے بزرگوں کو سماجی بندشوں کو، اخلاقی قدروں کو اور خود اپنی ذات کو بھول کر صرف اسی کے ہو رہیں، میں اُسے ''عشق'' نہیں سمجھتی۔ یہ وقتی جذبہ ہے۔ ہوس ہے جوان کو اکثر بھٹکا دیتی ہے اور عمر بھر رونا پڑتا ہے۔ اس میں عمر کی، شادی شدہ یا غیر شادی شدہ کی قید نہیں۔ حرص و ہوس ہر حال ہر عمر میں انسان کو گمراہ کر سکتی ہے۔ ایسے جذبوں کی ترجمانی یوں کی جائے کہ اشاروں میں ان کی تباہ کاریاں دکھائی جائیں تو فبہا لیکن ان سے کام لے کر اپنے ناول یا کہانی کو چٹ پٹا بنایا جائے یا اگر فن ہے تو شکر ہے کہ میں اس فن سے نفرت کرتی ہوں۔''

(۳)

بیگم صالحہ عابد علمی، ادبی اور مذہبی خاندان کی پروردہ تھیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان میں اسی اثر سے فوق انا بھی متاثر و مضبوط ہوتا رہا، جس نے ہمیشہ انکی ایڈ پر بالا دستی قائم رکھی اور سماجی اخلاقیات سے باغی ہونے سے بچائے رکھا۔ یہی وجہ ہے ان کے یہاں آدرش کا پرچار زیادہ ملتا ہے۔ اگر چہ یہ صحیح ہے کہ وہ اس حد تک ملتا ہے کہ گراں گزرنے لگتا ہے اور ان کے کردار مثالی نوعیت کے ہو جاتے ہیں تاہم امر واقعہ یہ بھی ہے کہ انکے ارد گرد جو لوگ تھے وہ واقعی بے نفسی اور ایثار کا مظہر تھے۔ وہ ایسی شخصیات تھیں جنکی سماج کی اصلاح اور قوم کی بھلائی میں کافی کاوشیں رہی ہیں، اسی کا لاشعوری طور پر اثر ان میں بھی در آیا۔ وہ اپنے کرداروں میں ان مثالی شخصیتوں کو تلاش کرتی ہیں یا لاشعوری طور سے یہ چاہتی ہیں کہ انکے کردار ویسے ہی عادات و خصائل کے حاملین ہوں۔ مصنفہ کی ذات میں سخاوت، اصلاح اور ہمدردی کے جذبات کا بدرجہ اتم پایا جانا اسی اثر کا نتیجہ ہے۔

بیگم صالحہ کی خود نوشت میں من حیث المجموع ساری انسانیت کا غم اور بالخصوص مسلم معاشرے کی فلاح و بہبود کی خواہش ملتی ہے۔ عورتوں کے مسائل سے انکو خاصی دلچسپی ہے۔ وہ اس طبقہ کی خوشحالی اور آزادی کی آرزومند نظر آتی ہیں۔ وہ حقوق نسواں کی ترجمانی میں پیش پیش رہتی ہیں اور انکے مسائل کو دیگر موضوعات پر مقدم رکھتی ہیں۔ عورتوں کے مسائل پر لکھنے سے وہ معتوب بھی ٹھہریں اور انہیں عورتوں کی ادیب کہہ کر ہدف تنقید بھی بنایا گیا لیکن انہوں نے اسے اپنے لیے باعث فخر اور خامی کے بجائے خوبی ہی ہمیشہ تصور کیا۔ اس تناظر میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''بے شک میں عورت بھی ہوں اور ادیب بھی۔ مجھے عورت ادیب ہونے پر احساس کمتری نہیں محسوس ہوتا۔ مجھے فخر ہے کہ میں عورت ہوں اور عورتوں کے مسائل کو اولیت دیتی ہوں۔ اس لیے کہ عورت کے مسئلوں اور کٹھنائیوں اور مشکلات اور پریشانیوں ہی کو نہیں اس کے جذبات اور احساسات اور دل کی کیفیات کو بھی جس طرح ایک حساس فن کار عورت سمجھ سکتی ہے مرد کے بس کا یہ روگ نہیں۔''(۴)

غرض بیگم صالحہ کی خودنوشت سے یہ بات بالکل واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ انکے کے اصلاحی مشن کا مطمح نظر مسلم معاشرہ خاص طور سے مسلم خواتین ہیں۔ وہ انکی بہبودی اور آزادی کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وہ فرقہ ورانہ ہم آہنگی اور انسانی مساوات میں اعتقاد رکھنے والی ادیبہ ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں تقسیم ہند اور فسادات کے بارے میں بھی روح فرسا لہجے میں خامہ فرسائی ملتی ہے، جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیم کے سانحے نے انہیں کس قدر صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ اس حوالے سے خودنوشت میں اپنی شدید نفسیاتی کشمکش کو قارئین پر ظاہر کرتی ہیں۔ اس عظیم سانحہ کے گہرے اثرات کو انکی خودنوشت میں ان الفاظ میں دیکھا جا سکتا ہے:

''اس (عذرا ناول کی) مقبولیت اور تحسین نے میری ہمت بندھائی اور میں نے اپنا دوسرا ناول لکھنا شروع کیا۔ یہ ناول ادھورا ہی تھا کہ ۴۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ وہ زمانہ دل و دماغ اور ذہن کے لیے کرب ناک تھا۔ ناول تو پڑا رہ گیا اور فسادات سے متعلق مضامین، کہانیاں وغیرہ لکھے جانے لگے۔ اس میں ذاتی تجربے بھی تھے، خاندانی بپتائیں بھی، پانی پت کے اُجڑنے کی داستان بھی اور گاندھی جی کی قربانی کے تاثرات بھی۔ میرے شوہر ہنگامی ادب کو ادب نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے تھے یہ ''جرنلزم'' ہے اور مجھے اس سے بچانا چاہتے تھے۔ مگر میں اس وقت یہ سب نہ لکھتی تو میرے دماغ کی رگ پھٹ جاتی۔''(۵)

مذکورہ بالا اقتباس اس بات کا بین ثبوت ہے کہ صالحہ عابد کا دل انسانیت کے غم اور جذبے سے لبریز ہے اور انسانیت کو درپیش مسائل، انہیں ذہنی ایذا پہنچاتے ہیں اور انہیں ابتلا و اُلجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں انکا سہارا 'قلم' بنتا ہے اور انہیں اس احساس سے کچھ تسکین دلاتا ہے کہ کم از کم وہ اپنے ذمہ فرض کو تحریر کی صورت میں ادا کر رہی ہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ مثالیت پسند اور اصلاحی نقطہ نظر رکھنے والی مصنفہ ہیں۔ انکی خودنوشت ہمیں انکے لاشعور کا سراغ دے کے انکی داخلی کشمکش کے ساتھ ساتھ

اُس ماحول اور زمانے سے بھی واقف کراتی ہے جو خود کشمکش کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔اس حوالے سے ڈاکٹر قمر رئیس کا انکی شخصیت اور ادب پر اظہار رائے بھی اسی دعوے کی تائید کرتا ہے، چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''صالحہ عابد حسین دلی کی نہیں لیکن ان کا تعلق اس بستی سے ضرور ہے جسے دلّی کا ایک محلّہ کہا گیا ہے۔ان کا نقطہ نظر اصلاحی ہے۔وہ گھریلو زندگی کے مسائل کو نسبتاً ایک وسیع انسانی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔بدلتی ہوئی قدریں، دونسلوں کے رویوں کا فرق ___ یہ ان کے خاص موضوعات ہیں۔''(۶)

اب تک کے تمام قرائن اور بحث کو ملحوظ رکھ کر اب اگر ''سلسلۂ روز و شب'' کے محرک کی بات کی جائے تو اس کا محرک تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔اس کتاب کی تخلیق کے پس پردہ جو نفسیاتی عوامل کارفرما ہیں وہ احساس برتری اور جذبۂ سخاوت (اپنے تجربات سے آگہی کرا کے سیکھ دینے کی چاہ) ظاہر کر کے اپنی انا کو تسکین پہنچانا ہے۔ان میں اس طرح کے جذبات تب تب اُبھر آتے ہیں جب وہ شدید نفسیاتی دباؤ محسوس کرتی ہیں۔اس طرح ان کی انا کو اس بحران کے وقت فرحت و تسکین کا احساس ملتا ہے۔خودنوشت کے دسویں باب سے اس دعوے کی تائید و توثیق میں ذیل میں دیا جا رہا اقتباس اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔میرے خیال میں اس نمونے کو پوری کتاب کا محرک ثابت کرنے کے لیے منطبق کیا جا سکتا ہے:

''اگر میرے اِس باب کو پڑھ کر کچھ لڑکے لڑکیاں، مرد عورت (شادی کے عرصے بعد بھی یہ دولت حاصل ہوسکتی ہے) کچھ سیکھ سکیں تو میں سمجھوں گی کہ میری یہ خامہ فرسائی رائیگاں نہیں گئی کہ دنیا میں بہت کچھ دوسروں کے تجربوں سے بھی سیکھا جا سکتا ہے۔''(۷)

صالحہ عابد کے ابتدائی ایام یعنی دورِ طفولیت کا اگر نفسیاتی اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو انکی شخصیت اور انکے ادب کی تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے کیونکہ بچپن کے حالات ہی انسانی شخصیت کے مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔ان کے ادب میں بھی بچپن کی کشمکش بھری زندگی کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے یا یوں کہنا چاہیے لاشعور بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ان کی پیدائش، جیسا کہ آغاز میں ہی بیان کیا جا چکا ہے، ایک علمی و ادبی خاندان میں ہوئی، جنکی علم پروری کی شہرت کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بجتا تھا۔وہ اپنے ماں باپ کی

چھٹی اولاد تھیں اور بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی۔انہوں نے اپنی پیدائش ،تربیت اور دیگر ابتدائی واقعات وحادثات کے احوال اپنے بڑوں کی زبانی سُن کر ایسے فنکارانہ انداز میں خودنوشت میں رقم کئے ہیں کہ گویا لگتا ہے جیسے وہ عینی شاہدان کی رہی ہیں۔انکے بقول انکی پیدائش قبل از وقت ہوئی تھی اور جسامت میں وہ بہت لاغر واقع ہوئی تھی۔شکل وشباہت بھی ویسی نہیں تھی جیسی گھر کے دیگر بچوں کی تھی۔ انہوں نے جس انداز میں ان سارے واقعات کو درج کیا ہے،اُس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بچپن کے حوالے سے ان کے دل میں کئی معاملات کو لے کر ایک حزن و ملال باقی رہا ہے۔ذیل میں دئے گئے اقتباس میں انکے پژمردہ اُسلوب سے اس کسک کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے:

> ''پھوپھی اماں نے بھتیجی کو گود میں لیا تو دم بخود رہ گئیں۔ان کے وجیہ وحسین بھائی کی بچی اور اتنی کالی،سوکھی،مریل۔ہوگی نامراد کوئی دو سیر کی۔دوسرے سب بچے سرخ وسفید،خوب صورت،موئے تازے ہوئے تھے۔نہ باپ کی صباحت وشکوہ،نہ ماں کی نزاکت و ملاحت۔پیٹ کی کھرچن،دیگ کی کھرچن کی طرح سلونی ہوتی ہے۔شاید یہ کھرچن جل گئی ہے!یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی کہ جس کی ماں نو مہینے بیمار رہی ہو،اس کا بچہ پیٹ میں کیسے پنپتا؟ کہاں سے سرخ وسفید خوبصورت پیدا ہوتا؟''(۸)

بہرصورت!انکی پیدائش کے بعد سے ابتلا وآزمائش کی وہ قطار بننا شروع ہوئی،جسکا سرا وقت آخر تک کہیں ختم ہونے کو نہ آیا۔ان میں جن مصائب وحادثات سے صالحہ عابد کو آغاز میں ہی گزرنا پڑا ان میں سب سے گہری محرومی والد صاحب کی موت تھی۔دوسری تکلیف دہ بات جس نے انکو بچپن میں سخت مغموم ومحزون رکھا،وہ انکی ماں کی مسلسل علالت تھی۔شعور کے سن کو پہنچنے کے ساتھ کانوں میں شکل وصورت سے متعلق منفی باتیں بھی پڑ رہی تھیں،جس سے معصوم سی جان کے دل پر ضربیں پڑتیں۔ان اُمور نے کہیں نہ کہیں لاشعور میں احساس کمتری کا جذبہ اُبھارنا شروع کر دیا۔خودنوشت میں مصنفہ کی یہ کشمکش قارئین پر ان الفاظ میں کھلتی ہے:

> ''مدتوں مجھے یہ یقین رہا کہ میں نہ صرف کالی بلکہ بہت بدصورت ہوں!ذرا بڑا ہونے کے بعد سہیلیوں،بہنوں بھانجیوں اور خود میرے شوہر نے اس کے برخلاف باتیں کہہ کر یہ خیال دور کر دیا۔اس دور کے یہ معصوم بزرگ نہیں جانتے تھے کہ ننھے حساس ذہنوں پر ایسے بد

مذاقی کے مذاقوں سے کس قدر تکلیف گزرتی ہے۔یوں بھی ہمارے گھرانے میں سب سے
چھوٹا بچہ ہونا بدقسمتی کی بات ہوتی ہے یا تو اُسے نظرانداز کیا جاتا ہے یا بے حد لاڈ پیار کیے
جاتے ہیں۔میری پیدائش تو ہوئی ہی ناسازگار حالات میں تھی۔ماں بیمار اور کمزور، باپ کا
انتقال ہو گیا۔مالی حالات بگڑ گئے۔صدمہ، بیماری اور ذمہ داریوں کے بوجھ نے اماں کو کچل
ڈالا۔مگر اس کے باوجود انھوں نے جو محبت اور توجہ مجھے دی،اس نے مجھے احساس کمتری کی
بیماری سے بچالیا۔ممکن ہے کسی صورت میں دل میں چھپی رہی ہو مگر بظاہر میں اس سے محفوظ
رہی۔''(۹)

ما حولہ بالا اقتباس کا آخری جملہ نفسیاتی اعتبار سے بہت معنی خیز ہے۔مصنفہ کا متذبذب ہونا اور دبے الفاظ
میں آخر پہ یہ کہنا کہ شاید لاشعور میں دفن کچھ حسرتیں رہی ہوں گی اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وہ خود کہیں
نہ کہیں محرومی و کمتری کا احساس رکھتی ہیں جس کے اظہار میں انہوں نے آخر پہ شش و پنج سے کام لیا ہے
کیونکہ خودنوشت میں موجود دیگر واقعات اس امر کی صراحت کرتے ہیں۔علاوہ ازیں ان کے بچپن کو مزید
خاردار اور تلخ بنانے میں خاندان کے کچھ لوگوں کی اموات کا سخت صدمہ بھی شامل ہے، جو انکی نفسیاتی
کشمکش میں اضافہ کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ان عوامل کے گہرے نقوش انکے ادب میں بھی نظر آتے ہیں۔
بچپن میں عزیزوں کی جدائی کو وہ جن المناک الفاظ میں بیان کرتی ہیں وہ ان کی شخصیت کی نفسیاتی کشمکش کو
اُجاگر کرنے میں کافی معنی رکھتے ہیں۔ان کی ذاتی زندگی کے صدمات کا اثر انکے ادب میں منعکس ہونے
پر خود انکی زبانی یہ حوالہ ملاحظہ کریں:

''زندگی بھر پیاروں کی جدائی کے صدمے سہے اور دل میں گھاؤ پڑتے رہے۔میرے حد
سے زیادہ حساس اور دلِ دردمند رکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔سوچتی ہوں تو یاد آتا
ہے کہ میری بچپن کی اولین دو یا تین یادیں بھی موت ہی سے وابستہ ہیں۔''(۱۰)

صالحہ عابد اپنی خودنوشت میں خود پر پڑے ان اموات کے اثرات اور ادب کے حوالے سے ناقدوں کے
اس اعتراض کہ انکی کہانیاں ''حزنیہ'' ہوتی ہیں کا خود اعتراف و اظہار کرتی ہیں اور اس کا جواب وہ یوں
دیتی ہیں کہ:

''میرے ناولوں (اور اکثر کہانیوں) کے لیے یہ کہا جاتا ہے (جس کی تعریف بھی ہوتی ہے
اور مذمت بھی) کہ وہ حُزنیہ ہوتے ہیں۔اس میں موت کا ذکر ہوتا ہے یا موت پر ختم ہوتے

ہیں......(اس) اعتراض پر غور کرتی ہوں تو ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ دو سال کی عمر سے ساٹھ سال تک میں نے اتنی موتیں دیکھیں، اتنے صدمے سہے ہیں اور اپنوں، غیروں، دوستوں، پڑوسیوں، مخالفوں، چاہنے والوں، نوکروں، بے سہارا اور مصیبت کے مارے لوگوں کی مصیبتیں اور موتیں دیکھی ہیں کہ پہلے شاید لاشعوری اور اب شعوری طور پر بھی، میرے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ موت اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔" (۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ بات اب اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ صالحہ عابد نے ہوش سنبھالتے ہی عزیز و اقارب کی اموات کا جو غم مسلسل پایا اُس نے انکی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ علاوہ ازیں انکی تحریریں اس حقیقت کی بھی غماز ہیں کہ انکا بچپنا عیش و فراغت کے زیر سایہ بسر نہیں ہوا، یہی وجہ ہے کہ ان سب کا لاشعوری اثر آخری دم تک ان کی نگارشات سے چھلکتا رہا۔

بیگم صالحہ کی تعلیم کے حوالے سے کلام کریں تو انکی تعلیم آغاز میں گھر پر ہی ہوئی۔ صرف انگریزی اور حساب پڑھانے کے لیے اُستاد گھر پر آیا کرتا تھا۔ ان میں خاندان کے اور افراد کی طرح جذبۂ تعلیم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اُنکی دیکھا دیکھی میں یہ خود چھپ چھپا کے وہ کتابیں بھی پڑھ لیتی تھیں جن کے پڑھنے کی اجازت گھر کی لڑکیوں کو بلعموم نہیں ہوا کرتی تھی۔ پھر چاہے انہیں کچھ سمجھ میں آتا یا نہ آتا۔ خواجہ غلام السیدین جو خود ماہر تعلیم تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر تعلیم کی بنیاد کمزور ہو تو عمارت بھی کمزور رہ جاتی ہے، نے انکا داخلہ گرلز اسکول میں کرایا جہاں انہیں خود کو چمکانے کا موقع ملا اور وہ پہلے ہی سال امتحان میں اوّل نمبر آئیں اور ڈبل پروموشن بھی ملا۔ انکی علم پروری اور شوق مطالعہ کے سلسلے میں صرف اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خودنوشت میں دو ابواب خصوصی طور پر 'کتابوں' سے متعلق ملتے ہیں، جو کتابوں کے تئیں انکی گہری وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اس حوالے سے ایک جگہ یوں لکھتی ہیں:

"مطالعہ کا چسکا کب پڑا یہ یاد نہیں، ہوش سنبھالا تو اپنے کو کتابوں کا شیدا پایا......دس بارہ سال کی عمر تک میں ہر قسم کی کتابیں جو میری راہ میں آئیں پڑھ چکی تھی۔" (۱۲)

اور اگر بات ذوق خامہ فرسائی کی، کی جائے تو وہ گویا انکو ورثہ میں ملا تھا اور قدرت نے جیسے انکے خون میں سیاہی ملا دی تھی۔ انکی بسیار نویسی سے اس بات کی اچھی طرح تصدیق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اس ضمن میں

رقمطراز ہیں:

”میں نے لکھنا کب شروع کیا؟ بعض وقت سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں نے پڑھنے سے بھی پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا......شاید ۸سال کی یا اس سے کچھ کم یا زیادہ عمر ہوگی جب سے ہم نے بزعمِ خود باقاعدہ مضمون نگاری کردی تھی۔“ (۱۳)

صالحہ عابد کی دورِ طفولیت کی کشمکش میں تعلیمی کشمکش بھی نمایاں ہے۔دورِ نہانی (Latency Period) جو چھ سے تقریباً بارہ سال تک کا عرصہ رہتا ہے اس میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا ذہن پڑھائی لکھائی جیسے کاموں میں لگا دیا۔اس میں کچھ موافق ماحول نے اپنا کردار ادا کیا۔گھر کے باقی افراد کے تئیں ان میں مسابقت اور ہم سری کا جذبہ اُبھرنا شروع ہوا۔جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ انکا خاندان علمی و ادبی نوعیت کا تھا اور ذی اثر تھا،لہذا ایسے ماحول میں اپنے آپ کو کم تر نہ محسوس ہونے دینا یا باعث خجالت نہ بننے کا لاشعوری جبر انکو ہمیشہ تحریک دیتا رہا اور مسابقت کا جذبہ انکے دماغ کو فعال رکھتا گیا۔اس سے تناؤ کی صورت حال پیدا ہونا یقینی بات تھی۔یہاں سے انہیں اپنی پیدائش بھی اضافی معلوم ہو رہی تھی۔اس پر یہ ستم کہ قدرت نے انہیں لڑکی پیدا کر دیا تھا جن کا حال آنکھوں کے سامنے تھا اور یہ احساس اور ڈر بھی تھا کہ انکے ذمہ خانگی اُمور کتنی ذمہ داریاں رہتی ہیں جو تخلیقی صلاحیات کو متاثر کرنے کی موجب بنتی ہیں۔ایسے حالات میں اپنی شناخت قائم رکھنا،اپنے وجود کو منوانا اور اہمیت محسوس کرانا انکے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں شروعات سے ہی احساس کمتری کے جذبہ کو جذبۂ برتری میں تبدیل کرنے کی سعی نظر آتی ہے۔یہ جہدِ مسلسل انکی داخلی کشمکش کی جانب صاف طور سے اشارہ کرتا ہے۔تلافی کا یہ عمل ناموافق حالات میں انکے لیے نشو و نما کا باعث بنا۔ہاں باقی جو بھی لاشعور میں حسرتیں اور ارمان دبے ہوئے تھے،وہ قلم کی صورت میں خارج ہوتے رہے۔ان بحرانوں نے کتاب و قلم کے ذریعے سے اپنی تسکین و نجات کا راستہ اختیار کیا جو خوش نصیبی سے ان کے لیے کارگر اور شخصیت کی تعمیر کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوا۔علاوہ ازیں سماجی اُصول اور تقاضہ کے ساتھ انکی فطرت کی مخالفت نہ ہونے نے ان میں Social Interest بھی بڑھا دیا۔دوسری طرف احساس برتری اور سماجی شعور کے باہم ملنے سے انکا نقطہ نظر اصلاحی ہونے لگا اور سخاوت کا جذبہ بھی پنپتا رہا،یوں نامساعد

حالات کے ہوتے ہوئے بھی انکی شخصیت انتشار کی شکار ہونے کے بجائے مثبت اور تعمیری رخ پر گامزن رہی۔

الغرض ہم پاتے ہیں کہ انہوں نے صغرسنی میں ہی اپنی زندگی کے مقاصد کا تعین کرلیا تھا۔علمی لوگوں کی صف میں کھڑے رہ کے اپنی تمام تر تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروے کار لانا دراصل احساس برتری کی قوّت اور تلافی کا اظہار ہے۔فرائڈ کے نظریہ کی رو سے دیکھیں تو ہم اسے سُپر ایگو (Super Ego) کا جبر بھی کہہ سکتے ہیں جو مسلسل کم وبیش انکی ایڈ کو دبانے میں کامیاب رہ رہا تھا اور ہمیشہ انہیں یہ احساس دلاتا رہتا تھا کہ کسی بھی صورت میں، خاندان کے لیے باعث عار و ننگ نہ بننے پاوں۔اریک اریکسن کے نظریہ کی روشنی میں اگر اس خاص دور کو دیکھیں تو اُنکے مطابق یہ وہ خاص دور ہے جس میں خودنوشت نگار مثبت کرائسس (crisis) سے گزر رہی تھیں۔''تعلیمی مشقت'' کو اس لیے انکے اس دور کا سب سے بنیادی محرک شمار کیا جاسکتا ہے۔ویسے یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ انکی 'مشقت' تعلیم کے ساتھ ہی خاص نہیں تھی بلکہ وہ ہر میدان میں اپنی اہمیت کو ظاہر کرانا چاہتی تھیں اور ہر ایک کام کے لیے مستعد بہ عمل رہتی تھیں جسے وہ گھر کے دیگر بچوں کو کرتے ہوئے دیکھتی تھیں۔اس حوالے سے یہ اقتباس لائق توجہ ہے:

> ''سیدین صاحب میرے ''منچلے پن'' پر اکثر فقرے کسا کرتے۔کہتے تجھے کسی بات پر اُکسانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔مگر دراصل وہ اس بات سے خوش ہوتے تھے کہ مجھے ہر کام کرنے، ہر بات میں حصّہ لینے کا شوق ہے اور میری بہت سی ''ہوبیاں'' ہیں۔''(۱۴)

بچپن کی پُر خار و پیچیدہ گلیوں سے گزر کر جب صالحہ عابد نے جوانی کی وادی میں قدم رکھا تو یہاں بھی پھول کم اور کانٹے زیادہ پائے۔یہاں بھی کشمکشوں کا ایک نہ رُکنے والا سلسلہ کھڑا تھا۔انہوں نے خود نوشت میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان اُمور کو بیان کیا ہے جو انکی کشمکش کا باعث بنے ہیں۔پھر خواہ وہ داخلی عناصر سے متعلق ہوں یا خارجی معاملات پر مبنی ہوں۔جوانی کے دور میں جو سب سے اہم پڑاؤ ہوتا ہے وہ شادی کا ہوتا ہے،اس حوالے سے اگر بات کی جائے تو قبل از بیان یہ ملحوظ رکھنا اہم ہے کہ انکی تعلیمی استعداد زیادہ نہیں تھی۔انہوں نے صرف مڈل تک پڑھا تھا،لیکن اعلیٰ خاندان سے نسبت اور اچھی سوجھ

بوجھ کے باعث کئی رشتے پیغام دے آیا کرتے تھے، مگر آخر میں جس شخص کے ’سرقرعۂ فال‘ نکلا وہ خواجہ غلام السیدین کے دوست ڈاکٹر عابد حسین تھے، جو پہلے سے شادی شدہ تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو گو طلاق نہیں دی تھی لیکن قطع تعلق ضرور کر لیا تھا۔ عابد صاحب صرف انکے اخراجات کی کفالت کرتے تھے۔ بہر صورت جب مصنفہ کے سامنے ان صاحب کا پیغام نکاح آیا، جس میں انکے بھائی اور اکثر لوگوں کی دلچسپی بلکہ اصرار تھا، تو مصنفہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ اس وقت انہیں جس طرح کے خیالات کچوکے دے رہے تھے، اُس کشمکش کو وہ خودنوشت میں ان الفاظ میں ظاہر کرتی ہیں:

> ’’مگر وہ (ڈاکٹر عابد حسین) عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ ان کی داڑھی ہے (جی ہاں اس وقت یہ اعتراض بھی کچھ کم اہم نہ تھا) ان کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے والد کے اصرار پر بچے کی خاطر دوسرا بیاہ کرنا چاہتے ہوں گے۔ یہ ’’انسلٹ ہے‘‘ میری ــــ یعنی لڑکی کی اپنی کوئی شخصیت نہیں، اہمیت انہیں، محبت پانے کا حق نہیں۔ وہ صرف نسل چلانے کا آلہ کار ہے؟ اور پھر ’’ان بچاری (انکی پہلی بیوی) کا کیا ہوگا‘‘ میں جو بزعم خود اس وقت بھی عورتوں کے حقوق کی حامی اور قلم کے ذریعے اس کا پرچار کرنے والی تھی، کسی عورت کا حق چھین لوں! نہیں۔ نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے!...... میرا دل و دماغ کشمکش ہی نہیں، ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ ......لاشعور میں ایک خاص تصوّر، ایک تمنا، ایک آرزو موجود ہوگی جو مجھے ٹارچر کر رہی تھی کہ جو شخص پہلے کسی سے رشتۂ محبت اُستوار کر چکا ہے، وہ دوسری کو کیسے وہ الفت، وہ مقام، وہ رفاقت دے سکے گا، جو اُس کا حق ہے ــــ اور پھر یہ کہ ’’میں تو ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی‘‘...... مگر بھائی جان کا حکم، بھابھی کا اصرار اور خاندان بھر کا بے قراری سے میرے فیصلے کا منتظر ہونا۔ میرے لیے یہ سب مصیبت بن گیا تھا!‘‘ (۱۵)

اس اقتباس کو سامنے رکھ کر اگر نفسیاتی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو انکی نفسیاتی کشمکش صاف انداز سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن اسکے بعد جلد ہی ہم خودنوشت کی روشنی میں یہ دلچسپ بات بھی دیکھتے ہیں کہ صالحہ اس رشتے کے لیے طوعاً و کرہاً سر تسلیم خم کرتی ہیں اور شادی کے بعد انکی شوہر سے جذباتی اُلفت بھی پیدا ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر میں اپنی مجموعی ازدواجی زندگی کو وہ خوشگوار قرار دیتی ہیں۔ انکے اس عمل سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہاں پر پھر اسی سُو پرایگو (Super Ego) کا غالب اثر دکھائی دیتا ہے جو گزشتہ اوراق میں ہم انکے بچپن کے حوالے سے ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس جگہ بھی مصنفہ پس و پیش کرنے کے بعد (جو انکی

ایڈ(id) کا تقاضا تھا) سُوپرا یگو(Super Ego) کے ہاتھوں مجبور ہو کے سمجھوتا کرنے لیے راضی ہوئیں۔ انہوں نے جبر کے اس پہلو کو لیکن اس احساس کے ساتھ قبول کیا کہ عابد صاحب سے تعلق و نسبت ان میں جذبۂ ہم سری و احساسِ برتری کو قوت بخشے گا جو انکی لاشعوری خواہش تھی۔ یہ انکے اور پورے خاندان کے لیے فخر و مباہات کا باعث بنے گا اور ساتھ میں اُس کمتری کے احساس کو زائل کرنے میں بھی نجات دے گا جو لاشعور میں خلشِ خار بنا ہوا تھا۔ قلم کا سہارا انہوں نے اپنی شناخت کو قائم رکھنے کے لیے اور برتری ظاہر کرنے کے لیے پہلے ہی اُٹھایا تھا، انکا ذہن انہیں یہ ترغیب دے رہا تھا کہ ان سے تعلق اس دھندلی شناخت کی تشہیر میں اور اضافہ کرے گا اور ان خواہشوں کی تکمیل ہو سکے گی جو لاشعور میں دبی ہوئی ہیں۔ خودنوشت سے انکا یہ اقتباس ان کی شادی کے تئیں اضطراب و کشمکش اور پھر معیارِ انتخاب کی نفسیاتی توجیہہ آشکار کرنے میں نہایت معاون ہے:

> ''میری کشمکش بڑھ چکی تھی۔ اب مجھے فیصلہ کرنا ہی ہے اور جلد کرنا ہے، دماغ نے فیصلہ دیدیا تھا کہ میری زندگی کا ساتھی ایسے ہی اخلاق و سیرت کا شخص ہوگا جیسے عابد ہیں۔ ان ہی کی میں عزت کر سکتی ہوں، عقیدت دے سکتی ہوں۔ محبت بھی ہو جائے گی۔'' (۱۶)

اس حوالے کی روشنی میں یہ عقدہ بڑے ہی احسن انداز میں کھُلتا ہے کہ اس انتخاب کے پیچھے صاف طور سے جو دماغ کے فیصلے کی بات کی گئی ہے وہ فوق انا کی کارفرمائی ہے۔ یہ فوق انا کبھی اتنا غالب آ جاتا ہے کہ مصنفہ کو کئی موقعوں پر نرگسیت پسند بھی بنا دیتا ہے۔ اس حوالے سے کئی نظیریں خودنوشت سے پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں نمونے کے طور پر صرف اس ایک اقتباس پر اکتفا کیا جا رہا ہے:۔

> ''مجھے دلی مسرّت اور فخر ہے کہ حالیؔ کی پرنواسی، غلام الثقلین کی بیٹی اور سیدین کی بہن نے اس ہستی کا انتخاب کیا جس میں اس کے بزرگوں کی بہت سی خصوصیات بڑے حسین امتزاج کے ساتھ سموئی ہوئی تھیں اور بعض باتوں میں وہ ان سے بڑھ کر نکلے ___ ان کی محبت تو فیصلہ کرنے سے پہلے ہی دل میں پیدا ہو چکی تھی مگر یہ وہ کیا جانتی تھی کہ اس نے جس شخص کا انتخاب کیا ہے، وہ اسے دنیا کی خوش قسمت ترین عورت کا مقام بخشے گا۔'' (۱۷)

''سلسۂ روز و شب'' کے مطالعہ سے یہ بات بالکل روشن ہے کہ شادی کے بعد عابد صاحب کے ساتھ انکے تعلقات مجموعی طور پر خوشگوار نوعیت کے رہے۔ جب کہ حقیقت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی دوسری منکوحہ

تھیں۔ وہ خودنوشت میں جگہ جگہ اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب اور مثالی قرار دیتی ہیں، اور قارئین کو اپنی شادی سے سیکھ لینے کا بھی مشورہ دیتی ہیں۔ انکی آپ بیتی میں جابجا اس بات کا اظہار ملتا ہے کہ انہوں نے شادی کے بعد اسکی کامیابی کے لیے ہر ممکن کاوشیں کی اور ہر اُس رشتے کا بخوبی لحاظ رکھنے کی سعی کی جو اسے خوشگوار رکھنے میں مدد دے سکتا تھا۔ انہوں نے عابد صاحب کے عزیز و اقارب، خصوصاً انکی بہن (نند)، انکے بچوں، حتیٰ کہ انکی پہلی بیوی تک کا بھی خندہ پیشانی سے خیال رکھا اور انکی خدمت کی۔ اس دوران ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی لیکن اُس نے دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی بند کرلیں۔ شومیِ قسمت اس کے بعد وہ پھر کبھی اُمید سے نہیں ہوئیں۔ ان سے جس خاص منشا و مقصد کے تحت شادی کی گئی تھی اُس میں ناکامی و حسرت ہی مقدر ٹھہری۔ خودنوشت میں اس بات سے پہنچے صدمے اور دکھ کا احساس جابجا ملتا ہے۔ اس محرومی کے شدید رنج نے انکو ہمیشہ گھیرے رکھا اور غم مسلسل عطا کیا۔ احساسِ برتری کا جو ایک سلسلہ رفتار کے ساتھ آگے ہی بڑھتے پایا تھا یہ حادثہ محرومی و شکست کا رفتار شکن بن کے اس سفر میں حائل ہوا۔ اس واقعہ نے انکو جھنجوڑ کے رکھ دیا اور اعصاب کو نئی کشمکش کے حوالے کر دیا۔ اس کی تلافی کے لیے انہیں اپنی ممتا، محبت اور شفقت کا خزانہ خاندان کے دیگر بچوں پر لٹانا پڑا۔ انکی کوکھ گو کہ مستقبل میں وجودِ اولاد سے محروم رہی لیکن قدرت نے جو دلِ مادر نوازا، اس نے اوروں کے بچوں کو اپنا کر، جذبۂ مادری کو تسکین دینی کی کوشش کی، مگر باجود اسکے انکے دل میں اس نعمت کی محرومی کی خلش تاعمر موجود رہی۔ اس کا اثر انکی تصنیفات خاص کر خودنوشت میں صریح انداز میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ ''خلشِ خار'' کے عنوان سے ہی خودنوشت کے ایک باب میں اپنی حسرت سنجی اور حزن و ملال کو ان کرب آمیز الفاظ میں پیش کر کے اپنی نفسیاتی کشمکش کا اظہار کرتی ہیں:

''شادی کے دس مہینے کے اندر میں ماں بنی مگر مُردہ بچی کی۔

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم، جسے دل کہیں سو ہری رہی

سرور کے چمن میں پھر بہار نہ آئی۔ شاخِ نہالِ غم آج بھی ہری ہے......میں نے ہزاروں راتوں کو اس (اپنی بیٹی) کی یاد میں آنسوؤں کی مالائیں پروئی ہیں......میری زخمی ممتا کی چیخ کسی نے نہ سُنی۔ میرے دل کی بھڑکتی آگ کی لپٹ کوئی نہ محسوس کرسکا۔ نہیں کہہ سکتی یہ

میرے حد سے زیادہ حساس ہونے کی وجہ تھی یا آیندہ اس نعمت سے محروم رہنے کا سبب، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ یہ آگ، یہ تڑپ، یہ بے قراری، اور غم میں لذت، کسی اور دکھ اور غم میں حاصل نہیں ہوئی۔ اگر میرا قلم میرے پاس نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

یہ بے بہا خزانہ اب بھی میرے دل کی گہرائیوں میں دفن ہے۔ لوگوں نے میرے فن میں اس کی ذرا سی جھلک دیکھ کر افسانے بنا لیے مگر کون جان سکتا ہے کہ یہ کیسا دُکھ، کیسی مسرّت، کیسی محبت ہے۔ مگر میرے فن نے مجھے زندہ رکھا۔ اور ہوش وخرد کی دولت، احساس اور دردِ دل کی وہ نعمت بخشی جس نے مجھے دوسروں کا دُکھ سمجھنے کی صلاحیت دی میں نے اپنی ''زندگی'' کی یاد میں درد ومحبت کی یہ دولت عمر بھر لٹائی ہے۔'' (۱۸)

صالحہ عابد کی خودنوشت میں بیماریوں کا تذکرہ بھی تکرار کے ساتھ ملتا ہے، پھر چاہے وہ خود سے متعلق ہوں یا اہل خاندان سے، مصنفہ ہر صورت میں اس آزمائشِ صحت سے نفسیاتی طور پر گہری متاثر نظر آتی ہیں۔ خودنوشت میں اس دعوے کی تائید میں اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ، دو باب الگ سے بعنوان ''لعنت بھی نعمت بھی'' اور ''درد ودرماں'' بیماریوں اور تیمارداری جیسے معاملات کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کے ساتھ تصادم، انہیں کس طرح نڈھال کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس سے پیدا جس احساس کمتری اور نفسیاتی کشمکش نے انکا محاصرہ کیا اُس کی جھلک اس اقتباس میں ملاحظہ کریں:

''بیماریوں کی بھی ہزاروں قسمیں ہیں۔ سخت بیماریاں، معمولی بیماریاں، نفسیاتی بیماریاں، فرضی بیماریاں اور وہم کی بیماریاں۔ عورتوں کے لیے بچّے ہونے کے سلسلے میں اس کے علاوہ یا اس کے ساتھ اور بھی بیماریاں مقدر ہیں۔ مگر میری بیماریوں کی نوعیت دوسروں کی بیماریوں سے مختلف رہی ہے۔ شدید بیماریوں کے کرب میں، میں نے بارہا سوچا ہے: ع

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اور بہتر ہونے کی حالت میں یہ جذبہ اُبھرا ہے: ع

زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

اور یہ دونوں مصرعے میری چوالیس سالہ بیماریوں کی تفسیر ہیں۔ نہیں جانتی یہ میری قسمت کا قصور تھا یا قدرت کو میرا امتحان لینا تھا کہ زندگی بھر میرے مختلف قسم کے امراض سے (جن میں سے کوئی معمولی نہ تھا۔ یا پھر ''معمولی'' کو میں نے مرض سمجھا ہی نہیں)'' بہت گہرے اور

قریبی تعلقات رہے ہیں۔ کیسے ان کو جھیلا، ان سے نباہا، کیسے اپنے دا اپاہج اور بے کار، بے مصرف ہونے سے بچانے میں کامیاب ہوئی...... یہ داستان طویل تو بہت ہے مگر لذ یذ نہیں ......میرا تو حال یہ ہے کہ دوسروں کا کیا ذکر خود مجھے ان لا تعداد بیماریوں کے ذکر سے شرم آتی ہے۔"(۱۹)

بیگم صالحہ عابد اس کمتری کے احساس کو زائل کرنے کے لیے کشمکش کی صورت میں قلم کا سہارا لینے کے ساتھ ساتھ خدا کا سہارا بھی پکڑنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ دو راہیں ان کی تسکین کا کسی حد تک سامان فراہم کرتی ہیں۔ اس کا اعتراف مصنفہ خود اپنی خودنوشت میں ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ وقت تو کٹ رہا ہے مگر کیسے یہ صرف میرا دل جانتا ہے میں نے اپنی اور دوسروں کی سخت بیماریاں جھیلی ہیں مگر عابد صاحب کی اس بیماری نے میرے دل و دماغ اور اعصاب پر اتنا اثر ڈالا ہے جو کبھی نہیں پڑا تھا۔ کام تو لکھنے۔ پڑھنے کا بھی کرتی ہوں، خاص کر لکھنے کا اس سے نہ صرف دماغ کو سکون ملتا ہے بلکہ مالی سہارا بھی مگر راتوں کی نیند ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ دن تو ان کاموں میں اپنے کاموں میں، عبادت، ہولی فیملی اور ڈاکٹروں کے چکّروں میں گزر جاتا ہے مگر رات۔ خدا کی پناہ! ہاں سہارا ہے تو اُس کا۔ اُسی کے سامنے روتی اور گر گڑاتی ہوں اور دل کو سکون بھی اسی کے ذکر سے ملتا ہے۔!"(۲۰)

ان امراض کی سختیوں کو جھیلنے کے دوش بدوش جب عابد صاحب کی موت کی جدائی نے صالحہ عابد کو بے سرو سامان کر دیا اور ان میں احساس کمتری و محرومی ایک ساتھ جمع ہو گئے تو ان میں یاس زندگی اپنی شدت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ عابد حسین، جو دنیا میں انکی آخری اُمید اور سہارا تھے، جب انکا انتقال ہو جاتا ہے تو خودنوشت میں مصنفہ کے یہ الفاظ جینے کی چاہت ختم ہونے اور دنیا سے دلبرداشتگی کے احساس کو بیان کرنے کے لیے بھرپور وضاحت کرتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی روح سے مخاطب ہو کے اُور انہیں اپنا دُکھڑا سناتے ہوئے یوں اپنی نفسیاتی کشمکش کو یوں ظاہر کرتی ہیں:

"دنیا میں ایسے غم بھی ہیں جو انسان کو قریب المرگ کر دیتے ہیں حالانکہ انسان بظاہر زندہ ہوتا ہے اور زندوں کی طرح ضروریات زندگی کے تمام ادوار سے گزرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ زندہ درگور ہوتا ہے۔ جسم ظاہری کو تو انسان لیے پھرتا ہے لیکن زندگی میں اس کے لیے کوئی

کیف باقی نہیں رہتا......'' کتنی بڑی سچائی۔کیسی اٹل حقیقت !!میں بھی زندہ ہوں،زندگی کے فرائض ادا کر رہی ہوں۔اب تو قلم نے بھی کام کرنا شروع کر دیا ہے۔آپ پر لکھ رہی ہوں۔کہانیاں لکھ رہی ہوں۔خودنوشت لکھ رہی ہوں۔مگر زندگی وہ زندگی نہیں رہی۔میں وہ ''میں''نہیں رہی۔''(۲۱)

الغرض !'سلسلۂ روز وشب' ایسی خودنوشت ہے جس میں صالحہ عابد کی زندگی کے شب وروز کے نشیب وفراز کی تمام سرگزشت موجود ملتی ہے۔اس میں انکی ساری محرومیوں،محزونیوں،پریشانیوں،انتشار اور اسکے ساتھ ساتھ انکی جہد مسلسل اور اُبھرنے کی نفسیاتی کشمکش واضح طور پر عیاں ہے۔اس آپ بیتی کا نفسیاتی مطالعہ انکے ادب کی تفہیم میں اور انکی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک کارگر ذریعہ ہے۔اس کی اہمیت میں یہ بات بھی اضافہ کرتی ہے کہ یہ اپنے اندر قارئین کے لیے ایسے راہ نُما اصول رکھتی ہے جو اُنہیں بہتر طریق سے زیست کا ہنر سکھانے میں مدد دے سکتی ہے اور بالخصوص درس دے کے یہ سمجھا سکتی ہے کہ آلام و مصائب میں اپنے اعصاب پر قابو پا کے کیسے ایک تعمیری زندگی،بلند حوصلوں کے ساتھ گزاری جا سکتی ہے۔

’’بری عورت کی کتھا‘‘ (۱۹۹۵ء) کشور ناہید

کشور ناہید اردو ادب کا ایک ممتاز اور نمایاں نام ہے۔ مشرقی معاشرے اور مسلم متوسط طبقے کی عورتوں کو جس جبر و استحصال، محکومیت اور جذباتی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس پر بہترین خامہ فرسائی اگر عصمت چغتائی کے بعد کسی کے یہاں ملتی ہے تو وہ کشور ناہید کے یہاں نظر آتی ہے۔ کشور ایک حساس اور حقیقت پسند تخلیق کار ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک کے سیاسی، سماجی حالات اور مسائل جیسے تقسیمِ ہند، سامراجیت، مذہبی انتہا پسندی، ہجرت اور آمریت جیسے عناصر سے وہ اس قدر متاثر ہو جاتی ہیں کہ انکا قلم دردمندانہ اور بے باکانہ انداز سے اسکی تصویر کشی کرنے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ ’’بری عورت کی کتھا‘‘ اس لیے جہاں کشور ناہید کی آپ بیتی ہے تو وہیں یہ خودنوشت پوری عورت ذات کی خودنوشت قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ مصنفہ کی نفسیات کے ساتھ ساتھ اُس پورے معاشرے، زمانے اور بلخصوص عورت ذات کی نفسیات اور انکے جذبات وخیالات سمجھنے کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔

’’بری عورت کی کتھا‘‘ خودنوشت چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کا مرکزی نقطۂ نگاہ بالخصوص حقوقِ نسواں کی بازیافت اور ان کی اہمیت کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔ ان ابواب میں چند نسوانی کرداروں کو علامتی طور پر موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، جن میں حوا، یشودھرا، زریں تاج، قرۃ العین حیدر، سیتا، صفیہ بی بی، اور لالوکا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ کشور نے ان عورتوں کے توسط سے عورتوں کی ابتدائے افرینش سے لے کر تا امروز، طبقۂ نسواں کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان ستم رسیدہ خواتین کی کہانی میں انہیں اپنی کہانی بھی نظر آتی ہے اور اپنے وجود کا عکس بھی کہیں نہ کہیں دکھائی دیتا ہے۔ خودنوشت کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے تلمیحاتی واستعاراتی لہجے میں اپنی ہی زندگی کے حالات سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو کشور کے

قلم سے لکھا ہر لفظ، انکی نفسیاتی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ادب اور شاعری میں موضوعات کے انتخاب کے پس پردہ اسباب اور نجی زندگی کے ساتھ اسکی مماثلت و مطابقت کے حوالے سے اپنی خودنوشت میں ایک جگہ یوں فرماتی ہیں:

''ہر نظم کی تخلیق میرے لیے بیک وقت سکون کا لمحہ اور عذاب کی دہلیز ہوتی تھی۔ مجھے نظم لکھتے ہوئے امتحان اور اذیت سے گزرنا پڑتا تھا کہ ہر لفظ میرے وجود کا خراج لے کر خود کو منکشف کرتا تھا۔ نظم لکھنے کے بعد جیسے نہائی ہوئی تر و تازہ ہلکی پھلکی، کئی راتوں کی نیند جیسے پوری ہوگئی، کئی دنوں کی بھوک جیسے مٹ گئی، ہر کتاب کو مرتب کرنا بچے کی پیدائش جیسا مرحلہ لگتا رہا ہے۔''(۲۲)

اس اقتباس کا اطلاق انکی خودنوشت پر اور زیادہ منطبق ہوتا ہے۔ انکی شاعری اور نثر، خاص کر اس خودنوشت میں جن موضوعات کی تکرار ملتی ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے مصنفہ کا ذہن انہی باتوں کو لے کے کافی متاثر ہوا ہے یہی چیز ان کے ادب سے پھر مترشح ہوتی ہے۔ انکی تحریریں اکثر مرد کی قوامیت، عورتوں کی محکومی، جنسی استحصال، فرسودہ رسم و رواج، اخلاقی اقدار سے دوری اور مذہبی انتہا پسندی جیسے موضوعات سے بھری ہوئی ہیں اور انکے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں۔ کشور ناہید کو اس پاداش میں بہت کچھ سننا اور سہنا بھی پڑا۔ کئی رشتے اس بغاوت کی نظر ہوئے۔ کئی قریبی رشتہ داروں، حتیٰ کہ گھر والوں نے نظریں پھیر دیں اور دروازے انکے لیے بند کر دیے، لیکن انہوں نے ایسے موقعوں پر گھبرانے کے بجائے جھانسی کی رانی کی طرح وہ ہمت اور عزم و استقامت دکھائی جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ اپنے نظریات و خیالات پر مسلسل قائم رہیں اور مخالفین کے خلاف اپنے قلم کے وار جاری رکھے۔ اس جرأت اور بے باکانہ طرز پر اظہار رائے کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ ''بری عورت کی کتھا'' کے پیش لفظ میں اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

''مواد و معلومات کے اعتبار سے بھی، ذہنی رویّے کے اعتبار سے بھی، اسلوب و اظہار سے بھی اور آرٹ فارم کے اعتبار سے بھی ''بری عورت کی کتھا'' ایک صدمہ پہنچانے والی، ایک جھنجھوڑنے والی اور سوچنے پر مجبور کر دینے والی کتاب ہے۔ اردو میں کسی عورت کے قلم سے نکلی ہوئی اپنی نوعیت کی یہ پہلی سوانح ہے۔ جیسے اردو شاعری کی ''پوری عورت کشور ناہید ہی

لکھ سکتی تھی۔ جنھیں بعض لوگ اردو شاعری کی 'لکشمی آف جھانسی' بھی کہتے ہیں۔'' (۲۳)

اسی طرح یوسف عالمگیرین بھی کشور ناہید کی شخصیت اور فن کے حوالے سے انہیں 'دبنگ عورت' کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ ان کے ترش و تند لہجے اور جارحیت پسندانہ رویّے کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کشور ناہید ادب میں آئیں تو ادب پر قبضہ کیے ہوئے مردوں نے انہیں خوش آمدید نہیں کیا، الٹا تنقید کے نشتر برساتے رہے۔ انہوں نے عورت ہونے کے باوجود ان نشتروں کی پرواہ نہیں کی اور اپنا سفر جاری رکھا۔ نظم کہی، نثر لکھی، تقریریں کیں، مشتعل ہوئی، اشتعال دلایا اور اب وہ سب کچھ کر دکھایا جو اس سے پہلے کوئی عورت کرنے کی ہمت نہیں کرتی تھی۔ دیگر عورتوں نے مردوں کو ان کی جگہ پر رکھنا انہی سے سیکھا۔ مردوں نے بھی جواباً ان کے ساتھ کچھ کم نہیں کیا اور ان پر ایسے ایسے الزامات لگائے کہ کوئی عورت بھی دوسری عورت پر ایسے الزامات نہیں لگاتی۔'' (۲۴)

آئیں اب جائزہ لیتے ہیں ان پس پشت عوامل کا جو کشور ناہید کی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما رہے ہیں۔ یعنی جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مصنفہ کیونکر جھانسی کی رانی اور دبنگ عورت بنیں اور یہ کہ انکے طنزیہ و ترش لہجے کے پیچھے کون سے اسباب پوشیدہ ہیں، ان کو کن نفسیاتی کشمکشوں کا سامنا رہا ہے اور یہ کہ کس طرح ان سے یہ نبرد آزما ہوتی رہیں۔ علاوہ اسکے یہ بھی آخر میں دیکھیں گے کہ اس کشمکش کے کیا اثرات انکے فن پر مرتب ہوئے۔

خودنوشت ''بری عورت کی کتھا'' میں کشور ناہید سب سے پہلے اپنے بچپن کے احوال پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے بچپن کے بارے میں کُھل کے اور تفصیل کے ساتھ بہت کچھ لکھا ہے جو انکی شخصیت کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں۔ کشور اپنے والدین، بھائی بہنوں، عزیز و اقربا اور دیگر افراد سے متعلق بہت سے تلخ واقعات و تجربات سے قارئین کو واقف کراتی ہیں۔ خودنوشت کے ابتدائی صفحات سے ہی یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کی مصنفہ نے صغر سنی سے ہی کس طرح کٹھن اور صبر آزما دور کا سامنا کیا تھا۔ انہوں نے کوئی بھی تامّل اور باک اپنے رشتہ داروں کو یا کسی بھی اذیت رساں شخص کو بے نقاب کرنے میں روا نہیں رکھا ہے۔ گھر میں ہو رہے سوتیلے سلوک و استحصال، اقارب کی سرد مہری و بے توجہی اور مختلف محرومیوں کا ذکر انہوں نے بے دھڑک ہو کے کیا ہے۔ یہ اظہار انکی گہری جذباتی کشمکش کو قارئین پر روشن کر دیتا ہے۔

کشور ناہید گھر والوں میں اپنی والدہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ اپنی خاوند کی چوتھی منکوحہ تھیں، جن کا دامن تین سوتیلی بیٹیوں کے تحفے سے شادی کے دن ہی بھر دیا گیا تھا۔ تینوں بیٹیاں تین ماؤں سے تھیں جن کا مزاج بھی مختلف تھا۔ اس وجہ سے گھر میں اُنسیت کا ماحول نہیں رہتا تھا اور بار بار صبر کے کٹورے بھر جاتے تھے۔ خودنوشت کے مطالعہ سے یہ آشکار ہوتی ہے کہ کشور کے ذہن و دل میں اپنی ماں کی اس دُکھ بھری زندگی کا کافی رنج و ملال تھا۔ وہ اپنی ماں کی زندگی کی ابتری و مظلومیت کے لیے اپنے والد کو زیادہ قصوروار ٹھہراتی ہیں۔ اپنے والد کے متعلق جو انکے تاثرات ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ ایک ظالم، جاہل قسم کا اور کم پڑھا لکھا انسان تھا۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر سخت پکڑ کرنے والا اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بڑی بے توجہی سے کام بھرتنے والا باپ تھا۔ اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں کہ وہ زندہ اولادوں میں پانچویں اور نمبر میں آٹھویں اولاد تھیں۔ اپنے وجود کو گھر والوں کے لیے غیر اہم اور اضافی بوجھ مانتے ہوئے وہ اسے اوائلی کرب اور کشمکش میں گردانتی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک جگہ اس بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''اب یہ باتیں مجھے اس وقت یاد آئی ہیں جب میں اپنی پیدائش اور زندگی کے سفر کے بارے میں سوچتی ہوں۔ میری پیدائش میرے گھر میں یقیناً کوئی واقعہ یا خوشی کا لمحہ نہ تھا کہ میں پانچویں تھی اور لڑکی تھی۔'' (۲۵)

گھر میں زائد از ضرورت ہونے کے احساس کے ساتھ طرہ یہ کہ کشور خوش شکل بھی نہیں تھیں اور صحت بھی اکثر خراب رہا کرتی تھی۔ ان محرومیوں نے انکے لاشعور میں ایک ایسے ناسور کی صورت اختیار کی جو ہر وقت انکی تحریروں سے رستا ہوا ملتا ہے۔ قدرت کی وجہ سے پیدا اس کشمکش کو اور اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپے حزن و ملال کو وہ ایک جگہ یوں طنزیہ انداز میں بیان کرتی ہیں:

> ''اس ساری شکل و شباہت کو گل و گلزار ٹائفائیڈ نے بہت کیا۔ ٹائفائیڈ اور میرا ساتھ بہت عرصہ رہا۔ پانچ سے سات سال کی عمر میں چار دفعہ ٹائفائیڈ ہوا۔ پھر بارہ سال سے چودہ سال تک کی عمر میں تین دفعہ ہوا۔ میرا جسم پیلاہٹ لئے ہوئے سفید ہو جاتا تھا۔ ساگودانہ کھا کھا کے مجھے لگتا تھا کہ میرا تالو ربڑ کا ہو گیا ہے۔ ماتھا تو پہلے ہی چھوٹا تھا، رنگ اور بھی گہرا بلکہ مٹیالا سلیٹی ہو گیا تھا۔ نقش پہلے ہی کھنڈ کی طرح اکھڑے اکھڑے اور انمل بے جوڑ

تھے۔حددرجہ پتلی، کالی، لمبی، چٹیا والی بتھ، یرمیری اُترتی تو اتنی ہولناک ہوتی جتنی میں خود تھی۔'' (۲۶)

کشور ناہید کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ مذہب، ادب، نجوم کی کتابیں اور اخبار بینی وغیرہ میں انکو بڑی دلچسپی تھی لیکن ستم ظریفی یہ کہ یہاں بھی انہیں بے جا پابندیوں اور حوصلہ شکنیوں سے سابقہ پڑا۔ انکے گھر میں ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھنا منع تھا جسکا انہیں شوق تھا۔ ادب سے متعلق کوئی کتاب اگر انکے ہاتھ میں دیکھ لی جاتی تو ایک ہنگامہ مچ جاتا تھا اور نجوم پر تو قیامت ہی برپا ہو جاتی تھی۔ اپنے ابتدائی دور کے تعلیمی شوق کے ساتھ قدغنیں لگائے جانے کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ خودنوشت میں اسے ان الفاظ میں تحریر کرتی ہیں:

''نماز کے جنون کے بعد ستاروں کا علم جاننے کا جنون سوار ہُوا۔ ساری ساری رات ستاروں کی جگہ بدلنے، ڈوبنے، پڑھنے اور ان تمام ستاروں میں اپنے مقدر کا ستارہ تلاش کرنے کی دُھن سوار ہوئی۔ ستاروں کے علم سے متعلق جو کتاب بھی مل سکتی تھی چھپ چھپا کر پڑھتی، اماں نے رات کو چھپ کر دبے پاؤں آ کر کوشش کرنی کہ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیں کہ شاید یوں لڑکوں سے ملنے کے بہانے تلاش کر رہی ہوں گی۔ مگر ان کے تو بدن میں آگ لگ جاتی کہ میں تو ستاروں کے زائچے بنا رہی ہوتی۔ میں گھنٹوں قرآن پاک لے کر بیٹھتی۔ اماں بھی بڑی خوش ہوتیں۔ جب دیکھا میں کچھ لکھتی رہتی ہوں، متفکر ہوئیں۔ بہنوں کے ذریعہ پچھوایا۔ میں نے کہا قافئے تلاش کرتی ہوں۔ بہت مار پڑی اور قرآن پاک کے ساتھ کاپی لے کر بیٹھنا منع ہو گیا۔ ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں کے زائچوں کی کتابیں جلا ڈالی گئیں اور ان لمحوں میں اماں نے ہمیشہ کہا 'ہائے میں نے تجھے کیا کھا کے جنا تھا'۔''

(۲۷)

انکی تعلیمی کشمکش کی وضاحت ان کا یہ ایک اور اقتباس بھی کرتا ہے:

''......اسی زمانے میں ایک رسالے کا شخصیات نمبر چھپا تھا اور افسانہ نگار خواتین کی شخصیات پہ مضامین بھی۔ یہ رسالہ میں بار بار پڑھتی......تو پھر یہ انگریزی کتابیں کچھ سکول اور پھر کالج کی لائبریری سے لاکر پڑھنے لگی۔ جو بھی میرے ہاتھ میں ناول دیکھتا، شور مچ جاتا۔ اب میں نے کتاب پڑھنے کا پروگرام ہی بدل ڈالا۔ سرشام دوسرے بہن بھائی پڑھ رہے ہوتے، میں سو جاتی اور صبح چار بجے جب سب سو رہے ہوتے تو اطمینان کے ساتھ کورس کی

کتابوں کے ساتھ، فکشن اور ناول پڑھ رہی ہوتی۔'' (۲۸)

کشور خودنوشت میں بیان کرتی ہیں کہ انکے گھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے دہرے معیارات تھے لیکن دوسرے باقی سب بھائی بہنوں کے بنسبت زیادہ دلچسپی انکی ہی تعلیم کے ساتھ تھی۔ اسکے باوجود انکے والد نے کبھی پڑھائی لکھائی کے لیے یا شعروشاعری میں دلچسپی رکھنے کے لیے انکی حوصلہ افزائی نہیں کی، بلکہ الٹا جھڑک دیتے تھے۔ خودنوشت میں انہوں نے جس طرح اپنے والد کا نقشہ کھینچا ہے اس سے ان کی سردمہری اور سخت رویّے کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ وہ انکے حوالے سے ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ابّا کے کم پڑھے لکھے رہ جانے کا ردِعمل اس شکل میں نظر آتا ہے کہ انہوں نے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت کی۔ اس حد تک کہ بچوں کی تعلیم کے لیے اضافی رقم دینے سے انکار کیا۔'' (۲۹)

اسی طرح مصنفہ ایک بار مشاعرے میں انعام پانے کے بعد والد کی غضب ناکی اور سرزنش کرنے کے واقعہ کو رقم کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ وہ میرے جج سے ملنے کی بات پر اتنے سیخ پا ہوئے کہ مجھے مخاطب ہو کر کہا:

''تم نے بہت نام کمالیا، خوب گپ اکھٹا کرلیے۔ جس کی غزلیں لی ہیں اسے واپس کردو۔ تمہارے گھر میں کوئی اتنا حد سے آگے نہیں بڑھا جتنی تم۔ اس لیے میرا کہا مانو یہ ڈرامہ بند کرو۔'' (۳۰)

یہ والد کے رویّے کی کچھ جھلکیاں تھیں، اب بہن بھائی کے آپسی تعلق کے بارے میں کشور کے خیالات جانیے:

''دراصل آج کل کی کدورتوں سے الگ ہو کر بھی ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں مگر بے کنار کا اظہار ہماری تربیت میں نہیں ہے۔ ہم ایک لالٹین میز پر رکھا پڑھنے والے اور ایک چھت کے تلے پلنے والے بہن بھائی ضرور تھے، مگر ایک دوسرے پہ محبت نچھاور کرنے اور جان دینے والے بہن بھائی صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ مسابقت کا جذبہ حسد کی سرحدوں سے جاملتا تھا۔ دوسرے کی خوبی یا کامیابی کو شکایت بنا کر پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا، ہمیں اپنے وجود کا اعتبار دلاتا تھا۔'' (۳۱)

کشور ناہید بلوغت کی منزل میں قدم ہی رکھ رہی تھیں کہ ان پر سخت قدغنیں لباس اور بات چیت کے حوالے سے لگنا شروع ہو گئیں۔ اس دوران جسم میں بھی ہو رہی تبدیلیوں نے انکی اُلجھنیں اور زیادہ بڑھائیں اور ذہنی انتشار کے ساتھ کشمکش میں اضافہ کیا۔ اس کا حل مصنفہ کے مطابق انہیں بہشتی زیور سے بھی نہیں ملا جسے وہ بار بار پڑھتی رہتی تھیں لیکن سمجھ نہ پاتی تھیں۔

اس خودنوشت میں ہم جنس پرستی اور اسکی وجوہ پر بھی کُھل کے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ مصنفہ خود کے ساتھ پیش آئے اس طرح کے واقعات اور کئی طرح کے جنسی استحصال و ہراسان کیے جانے کی باتوں کا اظہار کہیں دبے لہجے میں تو کہیں بے باکانہ انداز میں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کشور نے اپنے بچپن اور آغاز جوانی میں لڑکوں کے ہاتھوں تنگ کیے جانے کے ساتھ ساتھ خود پر اپنی استانی کا دماغ خراب ہو جانے نیز ہم جنس پرستی کی طرف دعوت دیے جانے اور گھر اور پڑوس میں گندی نظروں سے دیکھے جانے کا احوال بھی برملا ہو کے قلمبند کیا ہے۔ بطور نمونہ ان کے ساتھ بچپن میں پیش آئے کچھ واقعات کا ذکر مصنفہ کی زبانی ملاحظہ کریں:

> ''ہم سب مل کر آنکھ مچولی کھیلتے تھے...... کہ ایک دم چور لڑکی نے چیخ ماری 'اوئی کیا ہوا' ساری لڑکیوں نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں کے کونے والے گھر کے بزرگ جلدی جلدی کمر باندھتے ہوئے واپس پلٹ رہے تھے۔ سب لڑکیاں، چور لڑکی کے پیچھے پڑی تھیں 'بولو نا کیا ہوا، کیا تھا۔ بابا نے کچھ کہا' اور وہ چور لڑکی جو میں تھیں، سب انگلی اٹھائے، گھگھیائے لرزتے ہونٹوں اور شرابور بدن کے ساتھ، سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ دو چار گھروں کی بڑی بوڑھی عورتوں نے موقع کی نزاکت اور بات کو ادھ پچھتا سمجھ کر، سب لڑکیوں کو اپنے اپنے گھر میں دھکیل دیا...... تہجد اور جلالی وظیفوں کے زمانے میں میری عمر کوئی دس سال تھی۔ ...... گرمیوں کا زمانہ تھا۔ سب چھت پر سوئے تھے۔ میں مصلے پر تھی، عجب لگا آیا میرے وجود کے اندر سے ہوتی ہوئی کوئی انگلی سائے کی طرح گزر گئی۔ میرا منھ کڑوا ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر میرا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میں اماں کے پلنگ کے سمت پلٹی، اماں بستر پر نہیں تھیں، ابا کے پلنگ کی جانب دیکھا۔ ان کا پلنگ بھی خالی تھا۔ نچلی منزل کی چھت پر دیکھا وہی سایہ مصلے پہ کھڑا تھا۔ میں نے غصے میں اپنا مصلیٰ اٹھایا اور نیچے پھینک دیا۔ میری سمجھ میں نہ پہلے کچھ آیا تھا نہ اب کچھ آیا۔ میری سمجھ میں تو ٹھنڈا گوشت بھی نہیں آیا تھا۔''(۳۲)

کشور ناہید اپنی ہم جنس پرست استانی کا قصّہ بھی خودنوشت میں قلمبند کرتی ہیں، جس کی وحشت انکے معصوم ذہن میں تاعمر قائم رہی:

''صاحب زادوں کا دماغ تو درست ہو گیا' مگر استانی کا خراب ہو گیا۔.....ایک دن استانی جی نے اماں سے کہا کہ میں اسے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔ میں نے منع کیا بلکہ انکار کیا تو ماں نے سختی سے کہا کہ محبت تو پچتی ہی نہیں تجھے' استانی پیار کرتی ہے تو اڑ دکے آٹے کی طرح اینٹھتی ہی جا رہی ہے۔ مرتی کیا نہ کرتی' چلی گئی۔.....مشکل یہ تھی کہ کمرے میں پلنگ ایک ہی تھا' کرسی بھی نہ تھی۔ پلنگ پہ بیٹھنا لازمی تھا۔ ویسے میرے ذہن میں اب تک کوئی واضح خیال نہیں آیا تھا کہ منٹو کی ''ٹھنڈا گوشت'' کہانی کئی دفعہ پڑھنے کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔.....بہر حال وہ سارے قصے پھر مجھ میں زندہ ہوتے محسوس ہوئے کہ اب استانی جی کا ہاتھ میرے ماتھے اور منہ پر تھا اور ایک دھکے کے ساتھ میں بستر پر تھی۔ مجھے ہم آغوش کر کے ابھی دوسرے تکئے کو درست کرنے کے لیے انہوں نے مجھے ذرا چھوا تو میں نے ہاتھ جوڑ کر رونا اور گڑگڑا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے معاف کریں' مجھے گھر جانے دیں' ان کی والدہ اندر آ گئیں۔ میں نے برقعہ سنبھالا جلدی سے باہر آئی۔ بھاگتی بھاگتی پیدل ہی گھر پہنچی۔ سب میری اڑی رنگت پر حیران تھے۔'' (۳۳)

مصنفہ نے سید خاندان کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی کی عمریں ڈھل جانے کی غم ناک روداد بھی آپ بیتی میں تحریر کی ہے۔ وہ خود بھی سید گھرانے کی لڑکی تھیں۔ اپنی بہنوں کی عمریں نکل جانے کی وجہ، اس خاندان سے تعلق ہونے کو مانتے ہوئے وہ اس مذہبی رسم ورواج کی شدید مخالفت کرتی ہیں جس میں انہیں غیر قوم میں شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ وہ ایسی بہت سی لڑکیوں اور عورتوں کے جذباتوں کی ترجمانی کرتی ہیں جنہیں اپنی برادری میں کوئی کنوارا بر وقت نہیں مل پایا اور غیر قوم میں شادی کرنے کی ممانعت تھی۔ وہ لکھتی ہیں کہ ایسی عورتیں کو اس رسم کی وجہ سے اپنی جوانیاں برباد ہوتے ہوئے دیکھی پڑتی ہیں یا وہ کسی غلط راستہ کو چننے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔ کشور کے ذہن میں انکی ایسی بے بسی اور محدود رشتوں کے انتخاب کے عمل کی وجہ سے بغاوت کے شدید اثرات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ سماج کے مقرر کردہ قوانین کو چیلنج کر کے اپنی پسند کی شادی دوسری قوم میں کسی بھی صورت میں کر کے رہے گی۔ انکی خودنوشت سے ایک اقتباس کو اس حوالے سے ملاحظہ کریں جو کشور کے اس رسم سے

باغی ہونے کے نفسیاتی سبب سے پردہ اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی بہنوں کی شادی میں تاخیر کی وجہ اور خود پر پڑے اسکے منفی اثرات کے بارے میں لکھتی ہیں:

''...... پتہ چلتا آج اس بہن کا رشتہ آیا تھا، کل اس بہن کا۔ یا اللہ یہ روز روز کیوں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ رشتہ ہو کیوں نہیں جاتا' آخر پتہ چلا کی شریف زادے اور سید زادے چاہئیں۔ سیدوں کے خاندان کی لڑکی کو کسی اور ذات میں نہیں دیا جاسکتا تھا۔ پھر مجھے وہ سب بڑی عمر کی خالائیں اور پھوپھیاں یاد آئیں جو گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہوگئی تھیں جو اپنے بدن اور چادروں پہ دن رات اپنے ہاتھوں سے ہی کچھ کاڑھتی رہتی تھیں۔ بڑی بہنوں کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر میں نے خود سے عہد کیا۔ ''جیسے شریف زادے اور سید زادے'' بالکل بیوقوف جیسے میرے گھر والے تلاش کر کے لاتے ہیں' میں تو ایسے شریف زادے سے شادی نہیں کروں گی۔'' (۳۴)

اس کے بعد اگر کشور کی مذہبی کشمکش کی بات کریں تو مذہب کے تئیں بچپن سے ہی وہ دونوں انتہاؤں پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ کبھی عقیدت و عبادت میں غلو کر جاتی ہیں تو کبھی سرکشی و نافرمانی کے دہانے تک پہنچتی ہیں۔ وہ آخری عمر میں مذہب سے کلی باغی ہوئیں یہ تفصیل آگے آئے گی لیکن پہلے اس سرکشی کے ابتدائی نقوش ہم دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو ہمیں انکے بچپن میں مل جاتے ہیں۔ خودنوشت کے توسط سے سب سے پہلے ہم انکے آبائی مذہبی عقائد و نظریات کو دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے مذہبی پس منظر کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''اماں مولوی سید گھرانے کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ ننھیال میں سب مرد سرسید کے پیروکار تھے...... رہا لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ تو وہی سرسید کا تتبع۔ ''لڑکیوں کو صرف قرآن ناظرہ اور بہشتی زیور پڑھایا جائے۔'' (۳۵)

خودنوشت کی روشنی میں یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انکا گھرانہ مذہبی خیالات کا حامل تھا۔ حنفی مسلک اور سنی یت سے خاطر خواہ وابستگی تھی۔ نیز سرسید کی تعلیمات کا بھی گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اس وجہ سے مصنفہ پر کم عمری سے ہی مذہب کا اثر پڑا لیکن بدقسمتی سے وہ ابتدا میں ہی دین کے سخت تصور اور اطلاق سے متعارف ہوئیں جس نے بتدریج انکو مذہب بیزار بنا دیا۔ کشور اپنے بچپن میں قرآن پڑھانے کی سختی کا تذکرہ کرتے

ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ہم سب نے سات سال کی عمر میں قرآن پڑھ لیا تھا۔اماں خود پڑھاتی تھیں۔صبح کا ناشتہ، سیپارہ دہرانے کے بعد ملتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ صفحے چھوڑ چھوڑ کر پڑھوں کہ بھوک بہت لگ رہی تھی مگر اماں نے روٹی پکاتے ہوئے دوسرے بہن بھائیوں کوسکول بھیجنے میں مصروف ہونے کے باوجود تڑاخ سے کہا ''کیا کیا غلط'' صحیح پڑھو۔ میں خفت اور غصّے میں بڑبڑاتی ہوئی پھر چھوڑے ہوئے صفحے الٹاتی اماں کی نظر کا انگارہ کرتا'میری آنکھوں میں بھی خون اُتر آتا،چیختی ''مجھے بھوک لگی ہے......ایک تھپڑ سر چکرا دیتا اور پھر آنسوؤں سے بھیگتا سیپارہ اور ہچکیوں میں ڈوبی آواز کا تسلسل' پورے سیپارے کا ترازو بنتا......قرآن کو معانی کے ساتھ پڑھنا منع تھا کہ اس طرح ثواب ضائع ہوتا ہے۔...... ہر مذہبی کام کو اللہ کے حکم کی طرح اماں کے حکم کی شکل میں لازمی ادا کرنا ہوتا تھا۔سخت گرمیوں میں سارے بچے بھی روزے رکھتے اور پیدل سکول جاتے تھے۔لطف کی بات یہ تھی کی تنبیہ میں شرارت کے سارے راستے بتا دیئے جاتے تھے۔حکم ملا''خبردار جو کسی نے چھپ کر باتھ روم میں پانی پینے کی کوشش کی۔اللہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔''میں پیاس سے تنگ آ کر باتھ روم جاتی اور کہتی ''اے اللہ تو دیکھ رہا ہے۔مجھے کتنی پیاس لگی ہے۔دیکھ میں پانی پی رہی ہوں۔''(۳۶)

کشور ناہید کے دین کے سخت رُخ سے متعارف ہونے کی ایک اور مثال بھی یہاں ملاحظہ فرمائیں تاکہ انکے مذہب سے باغی ہونے کے ابتدائی اسباب کُھل کر سامنے آسکیں:

'' قیامت سے ڈرانے کی ہوا ہوش کے پہلے جھونکے کے ساتھ آئی تھی۔گڑیاں کھیلنا تو آواز''مت کھیلو ورنہ قیامت کے دن ان میں جان ڈالنا پڑے گی۔''دو چوٹیاں باندھنا تو تبرا''قیامت کے دن دو سانپ تیرے سر کے ساتھ بندھیں گے۔''چوڑیاں نہ پہنیں تو دبکا ''اللہ میاں چوڑیاں نہ پہننے والی کی نماز قبول نہیں کرتا'' قیامت کے دن پرسش ہوگی۔ ''چھت پر چڑھ جانا تو شور'اے ہے کوئی بلا بھوت چمٹ جائے گا۔اے ہے لڑکی پاٹ دار چٹیا ہے۔کوئی جن بھوت دیکھ لے گا'عاشق ہو جائے گا۔چل سر ڈھک' نیچے اُتر'ورنہ قیامت کے دن تجھے تیرا حساب اللہ میاں کے سامنے دینا پڑے گا'' جب کبھی سرکنڈوں کو علم کی طرح پکڑ کر عزاداروں کی طرح سینہ کوبی کرتے اور مرثیہ پڑھتے چلنا۔اماں نے دیکھتے ہی چٹیا پکڑ کر گھسیٹنا''کلموہی سید گھرانے کو بدنام کر رہی ہے' سینہ پیٹ رہی ہے۔اے قیامت

میں اللہ میاں تیرا سینہ پیٹیں گے۔''(۳۷)

اس طرح کی شدت کا مصنفہ کے نازک ذہن پر کافی منفی اثر پڑا۔ اگر چہ اس سے وقتی طور یہ ہوا کہ وہ دین کی طرف کچھ عرصہ خوف و جبر کی وجہ سے مائل ہوئیں لیکن مسلسل بندشیں انکی طبیعت پر گراں گزرنے لگیں اور وہ جلد مذہب کے تئیں شک و تردد کی شکار ہوئیں اور بعد میں متنفر ہو گئیں۔ ابتداً عبادات میں انتہا پسندی اور غلو کی یہ مثال دیکھیں:

''تہجد اور جلالی وظیفوں کے زمانے میں میری عمر کوئی دس سال تھی۔ رات کو دو بجے اٹھنے اور وضو کر کے مصلے پر بیٹھتے ہوئے مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگتا تھا۔''(۳۸)

اسی طرح ایک اور جگہ وہ اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''میں نے دن رات قرآن شریف پڑھنا، معانی پڑھنے اور تہجد کی نمازیں تک ادا کرنا، اپنے روزمرہ میں شامل کر لیا۔ اب پھر سب ناراض ''باؤلی ہوگئی ہے' ہر وقت نماز وضو جلال کے وقت، اور دونوں وقتوں کے ملنے کے سمے قرآن شریف پڑھنا اچھا نہیں۔ اس وقت کچھ کھانا پینا بھی اچھا نہیں۔ بس کرو۔''(۳۹)

غرض کشور ناہید جو کچھ بھی اپنی پسند اور مرضی سے کرنا چاہتی تھیں اسی وقت انکی حوصلہ شکنی کر دی جاتی اور انہیں روک دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ آگے جا کر نکلا کہ ان میں ضدی پن اور باغی ہونے کا احساس جاگزیں ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے عبادات کرنی ہی چھوڑ دی، شراب کی لت لگ گئ، پردہ کرنا ترک کیا اور رشتوں، مذہب اور سماج کے ان اصولوں کے قلادوں کو اُتار پھینکنا شروع کیا جو انکے مزاج کے منافی و مخالف تھے۔ حتیٰ کہ خدا کے رحمان و رحیم ہونے کے برعکس جو تصور کشور کے ذہن میں ان قدغنوں سے پیدا ہو گیا وہ جبار و قہار کا تھا جس کی وجہ سے وہ خدا سے دور بھاگنے لگی:

''میرے سامنے بچپن کا خدا کا رعب اور دبدبہ جس عالم میں بیان کیا جاتا' میں اسے آسمان پہ بادشاہ کے روپ میں بیٹھا متصور کرتی۔''(۴۰)

دور طفولیت کی ان مختلف جہتوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشور ناہید نے جس ماحول میں زندگی گزاری اور جس طرح کی محرومیوں اور آزمائشوں سے انکا سابقہ پڑا وہ ان کے اندر کئی نفسیاتی کشمکشوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ محبت و شفقت کی محرومی، گھر میں ماں سے ہو رہے ناروا سلوک

،مذہب کے سخت پہلو سے آشنائی،خود کی بے وقعتی اور حوصلہ شکنی اور آس پاس ہو رہی ناانصافیاں ایسے اُمور ہیں جنہوں نے ان میں احساس کمتری ،تذبذب اور باغی مزاج پیدا کر دیا۔

خودنوشت کی روشنی میں انکے مزاج کے بارے میں یہ بات آغاز میں ہی قارئین پر منکشف ہوتی ہے کہ کشور ناہید فطرتاً کافی حساس مزاج رکھتی ہیں اور سماج میں ہو رہی زیادتیوں اور استحصال نے انکے لاشعور کو گہرے طور سے متاثر کیا ہے۔مذہب کی طرف سے شدید احکام کے مطالبے نے بھی انہیں برگشتہ کیا کیونکہ ان کی طبیعت اس کی متحمل نہیں ہو پا رہی تھی۔ان سارے عناصر نے آگے چل کر ایک ایسی شخصیت کو تشکیل دیا،جس نے باغیانہ رنگ اختیار کر کے ''بُری عورت'' کا نام حاصل کیا۔

کشور کی بچپن میں شخصیت سازی کو اگر نفسیاتی اعتبار سے مشہور ماہر نفسیات اریک اریکسن کے نظریہPsycho Social Development کی چوتھی منزل کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس عقدہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جب چھ سے بارہ سال کے بچوں کی حد سے زیادہ حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور انہیں بات بات پہ ٹوکا جاتا ہے(جیسا کہ ہم مصنفہ کے یہاں پاتے ہیں)،تو ایسے بچے احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔مصنفہ کے بچپن میں بھی ہم ایسے ہی واقعات کی بہتات پاتے ہیں جن کو خودنوشت میں جگہ جگہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔وہ احساس کمتری کی صورت میں ردعمل کے طور پر بغاوت پر اُتر آتی ہیں۔یہ دراصل ایڈلر کے مطابق احساس کمتری کو احساس برتری میں تبدیل کرنے کی ایک کوشش سمجھی جا سکتی ہے۔اس اُلجھن سے فرار کی راہ بھی انہیں مل جاتی ہیں۔وہ ان کٹھن اور تاریک راستوں میں قلم کے دیے جلا کر چلتی ہیں۔انکی طرف سے قلم کے ذریعے بچپن سے ہی اس احساس کمتری کو احساس برتری میں تبدیل کرنے کی کوشش ملتی ہے۔اس طرح ان کے اس ذہنی خلفشار کو اخراج کا راستہ مل جایا کرتا تھا اور مصنفہ نیوراسس کی شکار ہونے سے بچتی رہیں۔یہ ''قلم'' ان کی زندگی کے ہر مشکل موڑ پر اور تنہائیوں کی وحشت میں انکا ہمدم و رفیق بنا رہا اور انکو تسکین پہنچاتا رہا۔

کشور کی ازدواجی زندگی کی کشمکش کے بارے میں بات کرنے سے قبل یہاں اس بات کو پھر سے دہرانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ سید گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔اس خاندان سے تعلق رکھنے والی کئی عورتوں اور خاص کر اپنی بہنوں کا حال ان کے سامنے تھا۔ان کے حساس مزاج میں باغیانہ روح

پھونکنے کے لیے یہ بات کافی تھی۔ان کے اندر اس مشاہدے سے پیدا شدہ داخلی کشمکش نے تب عملی اظہار پایا جب انہوں نے اپنی پسند کا لڑکا خود چن لیا اور اس کے ساتھ شادی بھی ہوگئی۔گزشتہ اوراق میں مختصراً اس حوالے سے کچھ عرض کیا جاچکا ہے یہاں تھوڑی اور تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

کشور ناہید نے اپنے خاندان کی عورتوں کا حال دیکھ کر ارادتاً اپنی قوم سے باہر ایک لڑکے کو پسند کیا۔ان کے دل میں ابھی محبت کے کنول کھل ہی رہے تھے اور محبت پروان ہی چڑھ رہی تھی کہ انکے ایک بھائی نے یہ رازِ محبت، گھر میں سب پر آشکار کر دیا اور آناً فاناً انکی شادی کردی گئی لیکن ساتھ ہی انکے لیے دل اور گھر دونوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔اس ہنگامی صورت حال نے انہیں حیرانگی کے ساتھ جھنجوڑ کے رکھ دیا۔اپنی شادی کے واقعہ کو نئے مصائب کا پیش خیمہ اور ناکام بتاتے ہوئے مصنفہ نے خودنوشت میں اس کا اعتراف جن الفاظ میں کیا ہے وہ انکی ازدواجی کشمکش کو آشکار کرنے میں اہم ہے:

"آدھے سیر لڈوؤں پر بیاہنے والی کے ساتھ ایک بوری میں کتابیں اور دوسری بوری میں انعامی کپ تھے۔تن پہ ایک جوڑا تھا۔تانگے میں بیٹھے ایبٹ روڈ کے ایک گھر پہ رُکے۔وہی سنت نگر والا انداز مگر ذرا فلمی انداز زیادہ۔ایک کمرہ کسی کا تو دوسرا کمرہ کسی کا۔سہاگ رات بھی عجب تھی۔دونوں چور لگ رہے تھے۔دونوں ڈرے ہوئے تھے کہ آدھے گھنٹے میں فیصلہ کرنے کے حکم پہ ہونے والی شادی کے لیے وہ تیار تھا نہ میں۔نہ اس کے گھر والوں کو خبر تھی اور نہ کسی دوست کو۔یہ سید زادے سے شادی نہ کرنے کے میرے فیصلے کی سزا،اس کو بھی مل رہی تھی۔......اسے خبر تھی کہ سید زادے سے یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔اس دبے دبے ماحول میں یہ نہیں رہنا چاہتی،گھر والوں سے یہ بھاگتی ہے۔رسموں سے یہ بھاگتی ہے۔انقلاب کی باتیں یہ کرتی ہے۔نوکری کرنا چاہتی ہے۔

اس نے میرے سارے ارمان پورے کیئے۔ہم دو آزاد شخص ایک گھر میں رہنے لگے۔میں ذمہ داریوں کے لیے آزاد۔وہ سائیکل کی جگہ موٹر پر اور پھر گاڑی میں۔لک چھپ جانا' مکئی کا دانہ......بہت خوبصورت تھا۔موٹر لیے انتظار کر رہا ہوتا کسی اور کا۔سال کے کیلنڈر سے پہلے اس کے انتظار کی جگہ اور شخص بدل جاتے تھے۔"(۴۱)

کشور ناہید نے اپنے شوہر کے انتقال تک باوفا رہنے کی اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی لیکن باجود اس کے انہیں حسب توقع وہ الفت و آسودگی اور وفا نصیب نہیں ہوئی جیسا وہ چاہتی تھیں۔انہوں نے اپنے

شوہر کی مکاریوں، عیاریوں، عادات و خصائل، انکی طرف سے ملنے والی اذیتوں اور ایک دوسرے کے تئیں اعتماد کی کمی کا اظہار بے باک ہو کے کیا ہے۔ خودنوشت میں ازدواجی نا آسودگی سے متعلق وہ مزید لکھتی ہیں:

''وہ میرے بیگ کی تلاشی لیتا تھا اور میں اس کی جیبوں کی۔ یہ تھی ہماری ایک دوسرے کے لیے عزت اور اعتماد کی چوکھٹ۔ وہ آ ہوئے آوارہ اور بنجارے کی طرح کبھی اس در پے کبھی اس در پہ، مگر رات کو واپس آتا گھر ہی تھا۔ میں نے ارنالہ وشیون کے باوجود سیتا کی لکیر کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکتی تھی۔ وہ جب سب سے چھپ کر باہر جانا چاہتا تھا۔ یہ خبر بھی میرے لیے حیرانی نہ بن سکی اور جب وہ سب کو بتا کر باہر گیا، میرے لیے یہ بھی کوئی دُکھ کی بات نہیں تھی۔ اس کی موت کے بعد جب اس کی چیزیں واپس آئیں اور اس کے بنک میں رقم نہیں تھی، تو میں اس پر بھی حیران نہیں ہوئی اور معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ آخر اس کی ڈیڑھ سال کی کمائی کدھر گئی۔ بہت میاں بیوی کی طرح ہم دو الگ الگ فرد، دو بچوں کے ماں باپ بن گئے تھے۔'' (۴۲)

شادی کے فوراً بعد ہی کشور کو معاش کی فکر بھی لاحق ہوئی، ساتھ ہی گھریلو کام کاج کا بھی ذمہ اٹھانا پڑا۔ یوں انہیں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی۔ اسی دوران انہوں نے اپنے اندر نئے مہمان کو بھی محسوس کیا لیکن تیرگی بخت! یہ مسرور کُن خبر جلدی غم کا پہاڑ بن کر ان پر ٹوٹ پڑا اور وہ حمل ضائع ہو گیا۔ اس دل دوز حادثے کو وہ خودنوشت میں کرب آمیز لہجے میں تحریر کر کے اپنی ایک اور نفسیاتی کشمکش سے پردہ اُٹھاتی ہے:

''......کہ جسم پہ بہار کا پھول مجھے اپنے اندر محسوس ہوا۔ مسلسل کام اور پریشانی نے اس کا گلا دبا دیا۔ ہسپتال نے پانچ ماہ کے بچے کو آپریشن کے ذریعے پیٹ سے نکال کر مجھے ایک اور اندوہ سے آشنا کیا۔'' (۴۳)

اس کے بعد بھی انکے لیے مصائب کا سلسلہ نہیں تھما۔ انکے سسرال والوں نے انکے ساتھ ناروا سلوک لگاتار رَوا رکھا اور ذہنی اذیتیں مسلسل پہنچائیں۔ شوہر کے ساتھ بھی آئے روز بحث و تکرار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جو کوئی کسر باقی رہ گئی تھی وہ اپنی اولاد نکال رہے تھے بلکہ مصنفہ کے مطابق وہ کوئی موقع ماں کو ذلیل کرنے میں نہیں چھوڑتے تھے۔ باپ اُنکی نظروں میں ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ انہیں کسی غلط بات پر کوئی روکتا ٹوکتا نہیں تھا جبکہ کشور انہیں تعلیم اور آداب کے لیے کبھی کبھار ڈانٹ بھی دیا کرتی

تھی۔ ایسے حالات اور صدموں نے مصنفہ کی نفسیاتی کشمکش میں اور زیادہ اضافہ کیا۔

خودنوشت میں کشور ناہید نام لیے بغیر اپنے کچھ معاشقوں کا ذکر بھی کرتی ہیں جو ناکام ہی ثابت ہوئے، کیونکہ انکے نزدیک انکا کوئی مستقبل اس سماج کی نگاہ میں نہیں تھا۔ وہ جس انداز سے داستان عشق سناتی ہیں اُس سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں خودسپردگی اور ٹوٹ کے چاہنے کا جذبہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ وہ ایک کنارے پہ رہ کے پیار کے بارے میں سوچتی ہیں۔ اس کے نفسیاتی اسباب پر غور کریں تو اسکے پیچھے شوہر کا رویہ کارفرما ہوسکتا ہے، جسے قیاس کر کے وہ سب مردوں کو ایک ہی سمجھتی ہیں۔ وہ بہت حد تک اسکی بے وفائی اور سردمہری کی ستم رسیدہ تھیں۔ اس وجہ سے لگتا ہے کہ اب انہیں مرد ذات پر اعتماد ہی نہیں رہا تھا۔ دوسری وجہ، والد کے کردار کا خاکہ بھی لاشعور میں ثبت تھا۔ ساتھ ہی اپنے آس پاس کی کئی عورتوں کی زندگی کی زبوں حالی بھی سامنے تھی جو مرد کی قوامیت اور بے وفائی کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہوئی تھیں۔ یہ ایسے ممکنہ اُمور ہیں جو انکی مردوں کے تئیں عدم دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔ خودنوشت کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کشور مرد ذات کے حوالے سے جہاں عدم اعتماد کی شکار ہیں، وہیں وہ انہیں ایک چیلنج کے روپ میں بھی دیکھتی ہیں اور کچھ خائف نظر آتی ہیں۔ انکا یہ ڈر جلدی غصّے میں تبدیل ہو کر انہیں ایک غیر معمولی جرأت بخشتا ہے اور ان میں انتقام کا جذبہ مرد ذات کے خلاف اُبھ آتا ہے۔ انکے یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہ جب یہ محسوس کرتی ہیں کہ انکی انا کو للکارا جا رہا ہے، وہ اپنی انا کی حفاظت کی لیے ہر ممکن مزاحمت کرتی ہیں لیکن جب انہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ مغلوب ہو رہی ہیں تو وہ اپنی تنہائی کی دنیا میں سمٹ کے رہ جاتی ہیں جہاں وہ سب سے بے نیاز اور بیزار ہو کے خود کو یہ باور کراتی ہیں کہ وہ شکست خوردہ نہیں ہیں۔ یہاں وہ احساس کمتری کو احساس برتری میں تبدیل کرنے کے لیے فوراً قلم کا سہارا پکڑ لیتی ہیں جو اس حالت میں انہیں عظمت و برتری کا احساس دلاتا ہے اور انکی انا کو تسکین پہنچاتا ہے۔ ان کے یہاں تنہا پسندی اور خود کلامی کا ایسا اثر غالب پایا جاتا ہے کہ انہیں انا پرست بلکہ نرگسیت پسند کا الزام بھی دیا جاتا ہے۔ کشور ناہید اپنے گھر میں خود کی وقعت اور روا سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے مذکورہ بالا ان تمام الزامات کی صفائی میں اپنی کشمکش کا اظہار یوں کرتی ہیں:

''گھر میں سارے مرد اور میں اکیلی عورت۔ اکیلے ہونے کا تمسخر بچے اور وہ بھی چھوٹے

بچے نے یوں اڑایا تھا کہ ''اماں اس گھر میں تو، معہ کتے کے سارے مرد ہیں۔آپ اکیلی عورت ہیں۔آپ ہمارا مقابلہ کیا کر سکیں گی۔'' یہ اور ایسے فقرے مزاح میں کہے جاتے اور سارے مرد اس پر خوش دلی ظاہر کرنے کو قہقہہ بھی لگاتے۔میں اولاد پہ ناراض ہوتی۔باپ کا جواب ''تم خود جیسا سلوک کرتی ہو اولاد ویسا ہی سلوک کرے گی۔'' ان کو شہ ملتی۔اب وہ اور شیر ہو کر مقابلہ کرتے۔......انکے ہمنوا باپ اور دوسرے رشتہ دار بنے۔......ہوتے ہوتے ماں Undesired قرار پائی اور اس میں کیڑے نکالنے کی ضرورت تقویت اختیار کرتی چلی گئی۔چونکہ پڑھنا لکھنا نامنظور تھا۔اس لیے ماں بھی نامنظور اور اب حوصلہ جاں، یہی افتخار کہ ماں کیا شے ہے۔سمجھتی کیا ہے، ہم بے عزتی کریں گے ماں کی، تو سب رشتہ داروں کی نظر میں بہادر ٹھہریں گے۔جری قرار پائیں گے اور ہماری اپنی شخصیت ہوگی۔گویا پڑھنے لکھنے اور علم کے ذریعہ عزت کمانے کا ہنر، معتوب گردانے جانے کے قابل سمجھا گیا اور یوں زندگی کے پلڑے میں نفرتوں کا ایک اور پتھر مار اگیا۔

تحریر نے ان نفرتوں کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہونے کا عہد کیا۔اس سیلاب کو روکنے کے لیے قلم نے بند باندھا۔گھر کے اندر ایک اور گھر بن گیا۔میرا اپنا گھر، میری ذات سے خود کلامی کا گھر، جس میں قلم اور کاغذ میرے دوست بن کر میری دلجوئی بھی کرتے اور مجھے مسکراہٹیں بھی دیتے۔ان کی دوستی پہ میں اس قدر اعتماد کرنے لگی کہ جس دن پڑھا نہیں، اس دن سمجھا کہ آج خالی خالی ہوں۔بالکل اکیلی ہوں۔

مجھے اکیلا رہنا بہت اچھا لگتا ہے ایک طرف ساری دنیا کو یہ معلوم ہے کہ میں محفلیں آراستہ کرتی ہوں اور دسری طرف میں اکیلی ہو کر دن میں ایک آدھ گھنٹہ بالکل الگ، بالکل خاموش اور اپنے حالات کے ساتھ دوڑ لگاتی، ہنستی مسکراتی اور پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوں۔مجھے خود سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔بری اور اچھی دونوں طرح کی باتیں میرے اندر گونجتی رہتی ہیں، میرے اندر سانس لیتی ہیں۔بری باتیں ذہن اور جاں کو خوب کچوکے دیتی ہیں اور اچھی باتیں مجھے اکیلی خوب ہنساتی ہیں۔میری ان عادتوں کی بنا پر کچھ لوگ کہتے ہیں میں انا پرست ہوں۔نرگسیت کی ماری ہوئی ہوں۔خود سے زیادہ کسی کو پیار نہیں کرتی، کسی رشتے کو اپنی ذات کے آگے نہیں آنے دیتی۔عورت، بیوی اور ماں بن کر جینے سے زیادہ مزا مجھے شاعری میں مل جاتا ہے۔میرے ذہن کا اُبال، خلجان اور تشنج سب کچھ شاعری ہی تو خارج کرتی ہے۔'' (۴۴)

خودنوشت کے حوالے سے کشور ناہید کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ملکی اور بین الاقوامی سطح کے سیاسی ،سماجی مسائل کا گہرا شعور اوران پر نظر رکھتی ہیں۔وہ اکثران حالات کونسائی زاویے سے دیکھتی ہیں۔مختلف جگہوں کی مظلوم عورتوں کی حالت زار پر قلمی احتجاج کرتے ہوئے کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود کا غصہ باہر نکال رہی ہیں اور در پردہ کہیں نہ کہیں استعاراتی لہجے میں اپنا ہی درد بیان کررہی ہیں۔انکے تقریباً سارے واقعات کا تانا بانا مردوں کے ذریعے عورتوں پر ظلم کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔انہوں نے پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، بوسنیا، سومالیہ، گھانا، کشمیر اور فلسطین میں ہورہے عورتوں کے ساتھ مظالم کو بڑے تلخ اور درد آمیز انداز میں پیش کیا ہے۔مردوں کے ہاتھوں عورتوں کی ذلت اور ظلم کی ایک تصویر ان کی خودنوشت سے ان الفاظ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

''اندھی صفیہ بی بی نے جب سوال کیا میرے ساتھ زیادتی ہوئی میں حاملہ ہوئی، میرے زیادتی کرنے والے کا نام نہیں جانتی، شرعی عدالت نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا، اس کے لئے ۲۰ کوڑوں اور ۱۶ سال کی سزا تجویز کی۔وہ بھی سزا سن کر شرابور ہوگئی تھی۔زمین اعتبار نہیں کرتی۔آسمان یقین نہیں کرتا مگر پاکستان میں ہوا۔گزشتہ ۱۴ برس میں ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۳ء تک شوہروں نے بیویوں کو زنا کے جرم میں جیل بھجوادیا کہ وہ سکون سے دوسری شادی کرسکیں۔بھائیوں نے بہنوں پر زنا کا الزام لگایا اوران کے حق وراثت ہڑپ کرلینے میں مردانگی محسوس کی۔بیٹیوں کو باپوں نے زنا کا مجرم گردانا کہ وہ اپنی مرضی کی شادی نہ کرسکیں اور باپ وہ زرفروخت حاصل کرسکیں جس کے عوض ان کی زندگی میں آسودگی آسکے۔''

(۴۵)

خودنوشت میں ۱۹۷۱ء میں سکوت ڈھاکہ کے دل دوز واقعہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔مصنفہ نے بچشم خود اس دور میں بہت سی بہیمانہ اور وحشیانہ وارداتوں کا مشاہدہ کیا تھا۔تاریخ کے اس سیاہ باب، اور عورتوں کے اس واقعہ میں مظلوم ومعتوب ہونے کے المیے کو کشور جیسی حساس اور درمند دل رکھنے والی تخلیق کار نے خود نوشت میں ان الفاظ کے ساتھ جگہ دی ہے، وہ لکھتی ہیں:

''بوڑھی گنگا کے کنارے کیمپ بھرا تھا۔عورتیں ہی عورتیں۔کیا میں انہیں عورتیں کہوں۔مشکل سے تیرہ سے پندرہ سال کی پتلی پتلی لڑکیاں جن کی ابھی چھاتیاں بھی سانس لینے نہیں پائی تھیں، مگران کے پیٹ چھٹے یا ساتویں مہینے کی گواہی دے رہے تھے، ان کے گھر والے کہاں

تھے، وہ تورات کے اندھیرے میں سازشی اور غدار کہہ کر مار دیئے گئے تھے.....وہ بے اماں
بے جگہ، بوڑھی گنگا کی گود میں، سوکھے ہونٹ اور سوکھی آنکھیں لئے سرنگوں بیٹھی تھیں۔"

(۴۶)

مغربی بنگال میں عورتوں پر ڈھائے گئے مظالم اور کشت وخون کے گرم بازار کی وجہ سے کشور ناہید اتنی متاثر ہوئیں کہ انکی صحت پر بھی برا اثر پڑا۔ اس المناک حادثے نے انہیں کئی مہینوں تک کے لیے خاموش کر دیا۔ وہ خود کی صحت پر پڑے برے اثرات اور اپنی حساس طبیعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

".....سامنے کا منظر دیکھ کر میری ناقابل برداشت چیخ نکل گئی، سامنے کا منظر ناممکن تھا......
اور اس کے بعد چھ ماہ تک میری آواز بند رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر اس کا سبب نہ سمجھ سکا۔" (۴۷)

کشور ناہید جہاں عورتوں کے حقوق کی بات کرتی ہیں اور انکی اکثریت کو مظلوم طبقہ گردانتی ہیں، وہیں وہ کئی عورتوں کی مکاری، فریب کاری، بے وفائی اور ظلم وستم کا ذکر کر کے مردوں کی اقلیت کو بھی مظلوموں کی صف میں جگہ دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ سماج میں کئی بدعات اور بے شمار ہو رہی ناانصافیوں کو بھی اُجاگر کرتی ہیں۔ مثلاً وہ رشوت ستانی، چاپلوسی، جھوٹی گواہی، ترقی کے لیے سطحی حرکتیں کرنا، ناحق سزاؤں، عدلیہ میں ناانصافی کی صورت حال، دفاتر اور محافل میں عورتوں کے استحصال، بچوں کے ساتھ جنسی زیادتیوں اور ہم جنس پرستی جیسے موضوعات پر بھی قلم کے نشتر چلاتی ہیں، اور سماج میں چھپے کالی بیڑھوں کو بھی بے نقاب کرنے سے نہیں چوکتی ہیں۔ ان کے خیال میں ایسے ہی عناصر ناسور بن کے سماج کو کھوکھلا بنانے کے لیے ذمہ دار رہتے ہیں۔ ان عناصر کا تذکرہ مصنفہ کی خارجی کشمکش یعنی سماج کے ساتھ متصادم ہونے کے دوش بدوش انکی داخلی کشمکش سے برسر پیکار ہونا بھی روشن کرتا ہے۔

'بری عورت کی کتھا' کے مطالعہ سے کشور ناہید کے یہاں خدا کے عدل اور مذہب کے بارے میں بھی شکوک اور اختلاف کی بحثیں ملتی ہیں۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں انکے بچپن میں مذہب کے تئیں میلان اور پھر باغی ہونے کے ابتدائی نقوش ملاحظہ کئے ہیں۔ خودنوشت سے اول تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کا گھرانا مذہبی خیالات کا حامل تھا۔ سرسید کی تعلیمات کا اس گھرانے نے بہت اثر قبول کیا تھا نیز یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بچپن میں وہ مذہب کے سخت پہلو سے آشنا ہوئی تھیں جس سے متحمل نہ ہونے کی صورت میں ان میں باغی پن آ گیا۔ بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے انہوں نے اعتدال کے بجائے انتہا پسندی کی راہ

اختیار کر لی تھی اور ان کے پاؤں مذہب کے راستے سے لڑکھڑا گئے تھے۔ اب وہ نفلی عبادات اور احکامات پر عمل پیرا ہونے کے بجائے اصل فرائض کی ادائیگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں، بلکہ حد تو یہ ہے کہ پورے دین سے ہی برگشتہ ہو گئیں۔ انکی مذہب بیزاری میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے بعض بنیادی اصولوں کو سختی کے ساتھ ہدف تنقید بنایا ہے۔ انہوں نے مرد کی قوامیت' کثرتِ ازدواج کی رخصت، سیاست میں عورتوں کی شمولیت، پردے کے احکام، عورتوں کو مارے جانے کی دین میں رخصت، عورتوں کی آدھی گواہی وغیرہ جیسے موضوعات پر انہوں نے کھل کر نکتہ چینی کی ہے۔ ان مسائل پر غور کریں تو ایک چیز جو ان میں مشترک نظر آتی ہے وہ عورت کی برابری کے حقوق اور آزادی کی خواہش ہے۔ یہاں اس بحث میں اُلجھے بغیر کہ کشور اپنے موقف میں صحیح ہیں یا دین کے ان احکامات کا غلط مفہوم اور نفاذ انکے سامنے پیش کیا گیا تھا، ہم انکے یہاں جو نفسیاتی اسباب ان کے مذہب اور خدا سے اختلاف کرنے کے دیکھتے ہیں، وہ درحقیقت انکا ذاتی غصّہ ہے۔ بچپن میں جس جبر کے ساتھ انکو مذہبی احکامات پر عمل کرایا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ جس مذہبی ریاکاری کا انہوں نے مشاہدہ کیا، اُس کا اَلاؤ لاشعور میں بچپن کی محکومیت، احتیاجی اور مخمصے کی وجہ سے تو قابو میں رہا لیکن انکے لاشعور میں یہ جذبات اپنا اظہار واخراج چاہنے کے لیے بیتاب رہے۔ اسی ذہنی کشمکش کے الاؤ کو قلم کی صورت میں باہر آنے کا موقع ملا۔ دوسری ممکنہ نفسیاتی وجہ مذہب اور خدا کے خلاف سینہ سپر ہونے کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ شفقت و الفت سے ہر طرف محروم رہی تھیں۔ عزیز واقربا کے بشمول خدا سے بھی جب وہ بے حد مایوس ہوئیں اور ہر طرف سے محبت کی محرومی کا احساس دل میں گھر کرنے لگا، تو احتجاجاً ان میں بغاوت کا جذبہ سر اٹھانے لگا۔ ردعمل کے طور پر وہ اپنے قلم سے سب کو غیظ وغضب کا شکار بناتی ہیں۔ جس میں خالق ومخلوق کسی کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اس کے دوش بدوش ان کی انا کو جب بھی کوئی للکارتا ہے تو وہ اپنے ہونے اور اپنی طاقت کو ہر ممکنہ طریقے سے ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لہذا انکے حوالے سے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ان کے اندر انانیت کا عنصر بھی انتہائی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہاں پہلے چند مثالیں مذہب کے مقابلے میں جرأت آموزی کے پیش کیے جارہے ہیں:

''عورت مرد کے رشتے کے بارے میں تو ہر مذہب نے مرد کو فوقیت دی ہے کہ ہر مذہب

مردوں کا لایا ہوا ہے اور مردوں نے اس کی تشریح کی۔''(۴۸)

عورتوں کو مذہب میں ایک حد تک مضروب کیے جانے کی رخصت کے بارے میں انکا تلخ وطنزیہ لہجہ اس طرح سامنے آتا ہے:

''مرد چاہے جتنا مارے اس کا حق ہے۔ بیوی جواباً ہاتھ اٹھائے تو یہ مردانگی کی توہین اور بیوی کی حدود سے متجاوز کرنا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بحثیں ان خیالات کو تقویت دیتی ہیں کہ عورت کو کس قدر اور کہاں کہاں مارا جانا از روئے شریعت جائز ہے۔''(۴۹)

کشور ناہید، لندن کی ایک دوست آلوف میرج کی اس رائے کی تائید بھی خودنوشت میں کرتی ہیں کہ:

''عورت ماں ہے بچہ پیدا کرتی ہے۔ آپ پیدا کرنے والے کو خدا کہتے ہیں اور عورت کی ہمسری سے انکار کرتے ہیں۔''(۵۰)

المختصر! 'بری عورت کی کتھا' کشور ناہید کے ساتھ ساتھ پوری صنف نازک طبقے کی سوانح حیات ہے۔ یہ خودنوشت جہاں مصنفہ کی نفسیاتی کشمکش کا پتا دیتی ہے تو وہیں یہ پس پشت عوامل کے ساتھ ساتھ انکی نبرد آزمائی وردعمل کو بھی سامنے لاتی ہے۔ اس سے ان کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں بہت آسانی ہوتی ہے۔ انکی آپ بیتی سے یہ بات صاف طور سے عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے عمر بھر محرومیوں اور مصائب کا سامنا کیا ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انکے یہاں تلخی و بے باکی، باغی پن اور ترش گوئی ملتی ہے۔ یہ ایسے عوامل ہیں جو انکی شخصیت سازی کے پس پردہ کارفرما رہے ہیں اور جس نے کشور ناہید کو ''بُری عورت'' کہلوایا۔ انہوں نے احساس کمتری ومحرومی سے نجات پانے کے لیے اور اسکی تلافی و برتری کے احساس کے لیے ''قلم'' کو سہارا بنایا اور اپنے ذہنی خلجان وتشنج کو اس کے ذریعے سے خارج کیا۔ آخر میں انکی کشمکشِ حیات کا لب لباب اور احساس کمتری و برتری کے تصادم کو اس جامع اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے:

''زندگی کے اس See-Saw پہ میں سوار تھی۔ مگر اخلاقیات کے متضاد ردعمل کے باعث، میرے اندر کی ذات نے اپنی اخلاقیات خود مرتب کی کہ جس کے سامنے میں خود جواب دہ تھی۔ میرے اندر کی ذات نے بحرانوں سے نکلنے کے لیے بھی خود لائحہ عمل مرتب کیا۔ اس کی دو شکلیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے اندر سفر شروع کر دو اور قبرستان میں پہروں مزاروں پہ بیٹھنے والی۔ داتا صاحب سارا دن پڑی رہنے والی بی بی بن جاؤ۔ یہ میری رگوں میں دوڑتے خون کے لیے شرمناک تھا۔ دوسرا طریقہ خود کلامی اور تحریر کا تھا۔ یہ سچا ثابت

ہوا۔خون کے رشتوں سے بھی زیادہ مستحکم۔اولاد سے بھی زیادہ قریب۔“(۵۱)

اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' اور نفسیاتی کشمکش

اختر الایمان کے شعری مجموعے اور بلخصوص انکی خودنوشت ان کی نفسیاتی کشمکش کی ساری داستان پیش کرتے ہیں۔عجب اتفاق ہے کہ ان مجموعوں کے اسماء بھی انکی ظاہری اور روحانی کشمکش کو اُجاگر کرتے ہیں۔پہلا جو مجموعہ ہے وہ ''گرداب'' کے نام سے ہے۔یہ مجموعہ ایک عجیب سی نفسیاتی کشمکش کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر'' بھنور'' کی آنکھ میں گرفتار ہے۔گویا حیات وممات، ظلمت ونور اور حرکت وجمود کے درمیان کہیں معلق ہوکر رہ گیا ہے۔دوسرے مجموعے کا نام ''تاریک سیارہ'' ہے۔یہ مجموعہ بھی اس کشمکش کو جو روح کے اندر کہیں ملفوف تھی ذہن کی سطح میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے،اس انداز سے کہ شاعر آسمانی اُڑان کو چھوڑ کر زمینی مظاہر کی طرف لوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔''اس آباد خرابے میں'' سے بھی مصنف کی بہت سی نفسیاتی کشمکش کی تصویریں اُبھر کے سامنے آتی ہیں،جس سے انکی شخصیت اور انکے فن کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔اِس خودنوشت کا نام انکی ایک نظم ''یادیں'' کے ایک مصرعہ سے لیا گیا ہے۔ان کی یہ نظم بھی مصنف کی نفسیاتی کشمکش کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے۔

''اس آباد خرابے میں'' کا مطالعہ کرتے ہوئے جب ہم اختر الایمان کے دورِ طفولیت کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے ہم جس چیز سے روشناس ہوتے ہیں وہ انکے بچپن کے تلخ تجربات وحادثات ہیں۔اس تناظر میں دیکھیں تو بیشتر معاملات میں خودنوشت سے یہ معلوم پڑتا ہے کہ انکے والد کا انکے بچپن کو پرُ اَلم اور خار دار بنانے میں کافی زیادہ رول رہا ہے۔ان کے والد پیشے سے ایک امام تھے اور خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے تھے۔وہ اپنے بیٹے کو بھی اکثر اپنے ہی ساتھ لے جاتے تھے۔اس کی وجہ سے انکی ماں کو اکثر میکے میں ہی رہنا پڑتا تھا،جس کا منفی نتیجہ یہ نکلا کہ اختر الایمان ماں کی محبت وشفقت سے محروم رہے۔انکے والد سخت مزاج تھے اور طبیعت میں رنگینی بھی پائی جاتی تھی لہذا ان باتوں کو لے کر اکثر انکے والدین کے

مابین مخاصمت رہا کرتی تھی۔ان منفی رویّوں کا یہ اثر ہوا کہ ان میں ذہنی خلفشار اور نفسی دباؤ گھر کرنے لگا۔ انہیں ویسا ہنستا کھیلتا بچپن نصیب نہیں ہوا جیسا ہونا چاہیے تھا۔اس طرح وہ محرومیوں اور احساسِ کمتری کے شکار ہوتے رہے۔خودنوشت میں انہوں نے اپنے والد کے کردار اور والدین کے باہمی تعلق ونزاع کے اسباب کا اظہار بڑی بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔ذیل میں دیا جارہا اقتباس انکی اوائلی کشمکش کو بیان کرنے میں اہمیت کا حامل ہے:

> ''میرے والد امامت کا پیشہ کرتے تھے۔انہوں نے مذہبی تعلیم سہارنپور میں حاصل کی تھی۔ بہت اچھے قاری تھے۔انہیں دیہات بہت پسند تھے۔امامت کے علاوہ وہ مسجد کے صحن میں مکتب کھولتے تھے۔جہاں دیہات کے ہر عمر کے لڑکے لڑکیاں پڑھنے آتے تھے۔کمباسی میں جمیلہ نام کی ایک لڑکی ان کے پاس پڑھنے آتی تھی۔گورا رنگ، لانبا قد، چھریرا بدن، دل آویز ناک نقشہ۔ابّا اس میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔کچھ دن بعد جمیلہ نے آنا بند کر دیا اور ابّا نے یہ گاؤں چھوڑ دیا۔میرا خیال ہے کہ کم وبیش ایسا ہی واقعہ ہر جگہ پیش آیا تھا۔ابّا گھر میں سوتے بھی نہیں تھے، مسجد کے حجرے میں رہا کرتے تھے......ابّا اور اماں میں ایک دوری تھی۔وہ زیادہ تر اپنے میکے میں رہتی تھیں۔اماں ان پڑھ تھیں۔ابّا کے مزاج میں تھوڑی رنگینی تھی۔شاید یہ دو باتیں اس دوری کا سبب تھیں۔''(۵۲)

اختر الایمان اپنی ابتدائی کشمکش کے حوالے سے خودنوشت میں خود کی تعلیمی کشمکش سے بھی پردہ اُٹھاتے ہیں۔انکے مطابق انکے والد انہیں اپنی طرح کا امام، حافظ اور قاری بنانا چاہتے تھے، لیکن انہیں ایسی تعلیم اور والد کی طرح زندگی گزارنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ نہ تو اپنے والد کی رنگین مزاجی اور خانہ بدوشانہ زندگی کی وجہ سے کسی مدرسے میں مستقل طور سے تعلیم حاصل کر پارہے تھے نہ کسی اسکول میں پڑھ پارہے تھے۔دوسری طرف انہیں دنیاوی علوم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔مصنف اپنی تعلیمی کشمکش کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''میری تعلیم کا تصور ان کے ذہن میں وہی تھا جو انہوں نے خود حاصل کی تھی۔قرآن حفظ کرنا اور اردو فارسی کی تھوڑی شد بد۔تاکہ بڑا ہو کر میں بھی ان کی طرح امامت کا پیشہ اختیار کرسکوں، مگر خانہ بدوشانہ زندگی جو میرے والد نے اختیار کر رکھی تھی۔اس نے کبھی مجھے ایک طرح کی تعلیم پر نہیں جمنے دیا۔کبھی سرکاری اسکول میں داخلہ کرا دیا جاتا تھا، کبھی قرآن

حفظ کرنے پر لگادیا جاتا تھا اور بس دن رات ایسے ہی گزرتے جارہے تھے۔"(۵۳)

بعدازاں اس صورتِ حال کو انکے ایک چچا نے تب مزید اُلجھا دیا جب انکو ایک ریفارمیٹری اسکول "مدرسۂ موئیدالاسلام" میں داخل کرایا گیا اور اس بات کا علم انکی ماں کو نہیں ہونے دیا گیا۔ یہاں اختر الایمان نے چار سال تک پڑھا۔ اس جگہ جہاں ایک طرف انہیں اپنے آبائی وطن کی یاد بہت ستارہی تھی تو وہیں دوسری طرف وہ اپنی ماں کو بھی بہت یاد کرکے رویا کرتے تھے۔ "مدرسۂ موئیدالاسلام" میں جب انکا داخلہ انکی مرضی کے خلاف کرایا گیا تو داخلے کی پہلی رات کی کشمکش و بےبسی کا جو نقشہ انہوں نے خودنوشت میں کھینچا ہے اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے:

"مختصر یہ کہ چچا مجھے موئیدالاسلام میں چھوڑ کر چلے گئے...... جیسے جیسے رات بڑھی لڑکے سو گئے۔ میں ایسے ہی بیٹھا رہا۔ نیند ہی نہیں آئی پھر نہ جانے کیوں مجھے رونا آ گیا۔ ایسی اپنی ذات میں تنہائی کی زندگی تو میں بچپن سے گزار رہا تھا۔ پندرہ سال پرانی عادت تھی مگر اس رات مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ساتھ چھل کیا ہے اور روتے روتے سو گیا۔"

(۵۴)

۱۹۳۴ء میں 'آٹھویں جماعت' موئیدالاسلام سے پاس کرنے کے بعد انہیں چچا کے یہاں کچھ عرصہ مجبوراً قیام کرنا پڑا۔ یہاں انکی خالہ بھی تھی جن کے متعلق انکے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ ان کی ماں اور خالہ میں اختر الایمان کے یتیم خانے میں ڈالے جانے کی وجہ سے کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ غرض مصنف کو چچا کے یہاں چار و ناچار کچھ عرصہ گزارنا ہی پڑا۔ اپنی جبر وعسرت کی زندگی گزارنے کی کرب آمیز سرگزشت کو وہ ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں:

"انھوں نے مجھے یتیم خانے میں رکھا، اس لیے میں چچا کے یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مگر میری خواہش اپنی جگہ اور صورتِ حال اپنی جگہ۔ اس طرح کی مجبوریوں میں انسان جیتے ہیں، جیتے کیا ہیں "گزران" کرتے ہیں۔ صبح کی شام اور شام کی صبح کرتے ہیں...... میرا شمار کن لوگوں میں ہوسکتا ہے نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں بے چین رہتا تھا۔ میرا خون گرم اور آنکھیں جلتی رہتی تھیں۔ جڑا ہوا بھی انسانوں کے اس طبقہ سے تھا جو پیٹ بھرنے کو زندگی سمجھتے تھے۔"(۵۵)

اختر الایمان کے اندر ایک طوفان سا بار بار اپنی حالت کو دیکھ کے اُٹھ رہا تھا۔ اس بےبسی کی زندگی اور اپنے

گرد کے ماحول میں اکثر لوگوں کی زندگی کو دیکھ کر انکا خون کھول اُٹھتا تھا۔لیکن ناتجربہ کاری، کم عمری اور کسی شفیق کی شفقت و صحیح رہنمائی کی کمی کے باعث انہیں یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے، لیکن انہیں بس اتنا پتا تھا اگر اس کسمپرسی کی حالت سے نکلنا ہے تو علم حاصل کرنا ہوگا مگر ساتھ ہی ذہن میں یہ اضطراب بھی تھا اور یہ لایقینی صورتِ حال بھی مستقبل کے حوالے سے دامن گیر رہتی تھی کہ پڑھنے کے حوالے سے وسائل کہاں سے مُیسّر آئیں۔وہ اپنی اس ذہنی چپقلش کو قارئین پر ان الفاظ میں آشکار کرتے ہیں:

> ''دیہات میں پیدا ہوا تھا، دیہات میں ہی بچپن کا بیشتر حصّہ گزرا تھا۔مثال سامنے کھیت مزدورں یا کاشت کاروں کی تھی یا پھر مسجدوں میں امامت کرنے والے مولوی تھے یا اسکول کے استاد۔خواب ایسا دیکھتا تھا جیسے بازوؤں میں پر نکل آئے ہیں۔لوگ مجھے پکڑنے کی کوشش کرر ہے ہیں اور میں اُڑ کر کبھی اُس ڈال پر کبھی اِس ڈال پر۔ذہن میں ایک ہی بات بیٹھی ہوئی تھی اُڑنے کے لیے پر چاہیے تو علم حاصل کرو۔مگر کیسے، وسائل کہاں ہیں؟''
>
> (۵۶)

جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کی اس حالت کے پیچھے انکے والد کی سرد مہری اور بے توجہی کارفرما تھی لہذا اختر الایمان کے دل میں اپنے والد کے لیے ردِعمل کے طور پر غصّے اور بیزاری کے جذبات اُبھرنے لگے، جس کا اظہار خودنوشت میں جگہ جگہ ملتا ہے۔نمونے کے طور پر باپ بیٹے کے باہمی تعلق کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''مجھے یہ یاد نہیں انھوں نے بچپن میں کبھی مجھ پر اپنا پیار ظاہر کیا ہو سوائے ایک مرتبہ کے......
> میں ابّا کے پاس رہتا تھا مجھے وہ اس لیے جانے نہیں دیتے تھے میری پڑھائی کا حرج نہ ہو۔رہتا میں ضرور تھا ان کے پاس مگر ہمارے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا میں اپنے اندر سمٹ گیا۔''(۵۷)

ایسی صورت میں ذہنی و قلبی آسودگی حاصل کرنے کے لیے اور شفقت پدری کی محرومی کو پُر کرنے کے لیے، اختر الایمان قدرت کی آغوش میں خوب وقت گزارتے تھے، یہی ایک سہارا اس وقت انہیں کسی قدر آسودگی محسوس کراتا تھا۔اپنی محرومیوں کی تلافی اور ان سے پیدا شدہ کشمکش سے فرار کی راہ کے متعلق وہ

ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''باغوں اور کھیتوں میں گھومتا رہتا تھا۔ پیڑ پودے ہریالی، تالاب، جھیلیں، بہتا ہوا پانی ان سب کو دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوتی تھی۔'' (۵۸)

خودنوشت کے مطالعے سے جہاں ہم اختر الایمان کی نفسیات سے آگاہ ہوتے ہیں وہیں انکی نفسیات شناسی سے بھی روبرو ہوتے ہیں۔ اپنے والد کی نفسیات شناسی کے حوالے سے جو تبصرہ انہوں نے کیا ہے وہی بات عین ان پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ضدّی قسم کے انسان تھے اور ان کے اس ضدّی پن کی وجہ انکا خودساختہ ہونا تھا اور یہ خودساختگی ان میں سخت محنت کی وجہ سے درآئی تھی۔ اختر الایمان اس کے بعد خودساختہ لوگوں کی دو قسمیں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کو زندگی کی صعوبتوں نے ضدّی اور ہیکڑ بنایا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو منکسر المزاج اس عمل کے نتیجے میں بنتے ہیں۔ مصنف کی ذات ان دونوں طبیعتوں کا اگرچہ مجموعہ معلوم ہوتی ہے تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ذرا سا اختیار ملنے پر ان میں ضدّ کا پہلو زیادہ غالب آجاتا ہے۔ خودنوشت سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ وہ بے حد ضدّی مزاج رکھتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ انہیں یہ ضدی پن ورثہ میں ہی ملا تھا، یا اسکا نفسیاتی پہلو وہ ضد اور جبر بھی ہوسکتا ہے، جو انکے معاملے میں بھرتا گیا تھا اور انکے لاشعور میں اسکا انتقامی جذبہ تاعمر موجود رہا تھا۔ وہ اپنے اس مزاج کا خود اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب مجھے کوئی بات لگ جاتی ہے تو میں اپنا ارادہ نہیں بدلتا۔'' (۵۹)

خودنوشت سے انکے ضدّی مزاج کی متعدد نظیریں ملتی ہیں، یہاں چند ایک پر اکتفا کیا جائے گا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ انکی شخصیت میں ضدّ کا پہلو کتنا نمایاں ہے۔ خودنوشت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اختر الایمان کی شادی سلمہ نامی ایک لڑکی سے زبردستی کرا دی گئی تھی۔ اس فیصلے سے وہ بالکل خوش اور راضی نہیں تھے۔ دوسری طرف وہ اس وقت تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ہی انکی طبیعت میں اس جبر کو برداشت کرنے کی سکت ختم ہوئی اور ان میں یہ ضدّ اُٹھنے لگی کہ مجھے کسی بھی صورت میں اس رشتہ سے کنارہ کشی کرنی ہے۔ اس حوالے جو کام سب سے پہلے انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ انہوں

نے اپنی ماں اور بیوی کو چھوڑ کر تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تعلیمی شوق کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ جو شادی کے حوالے سے ان پر جبر کیا گیا تھا اور سابقہ محبت کی محرومی کی شکست کا جو کھٹکا لاشعور میں خلش خار بنا ہوا تھا ان باتوں کی تلافی کے لیے انہوں نے اپنی پہلی بیوی سے مسلسل دوری اختیار بنائے رکھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی بیوی کی نزدیکیاں ایک دوسرے شخص سے بڑھنے لگیں۔ یہ بات جب مصنف کے علم میں آئی تو انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر ایک دوسری لڑکی سلطانہ سے راہ رسم بڑھانا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں وہ دلی چھوڑ کر نجیب آباد اپنے گھر آئے، وہاں وکیل کو بلویا اور اسکے سامنے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اسکا سارا سامان دے کے اس شخص کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف سب تھے لیکن اختر الایمان نے جو اسے چھوڑنے کی ضد پکڑی تھی اس کے سامنے سب کو ہار ماننی پڑی۔ اسی طرح اپنی دوسری بیوی کے ساتھ شادی کرنے کی ضد پر یہ اقتباس دیکھیں:

> ''میرے گھر کے افراد والد، والدہ، تایا، چچا کے لڑکے کسی کو میری یہ بات پسند نہیں آئی مگر میں نے جو طے کر لیا تھا وہ کیا اور دلّی آ گیا۔ سلطانہ کے بڑے بھائی مجاہد علی سے ملا اور ان کے سامنے تجویز رکھی کہ سلطانہ سے میرا نکاح اب کر دیں رخصتی اگلے سال ہو جائے گی ان کا بڑا خاندان تھا۔ تھوڑی دیر انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ نکاح بھی اگلے سال ہی ہو جائے۔ مگر میں نے اپنے دلائل دیے اور اڑا رہا۔ آخر نکاح ہو گیا۔''(۶۰)

کر بات پر اڑ جانے اور ضدی پن کے رویے پر یہ مثال بھی دیکھیں:

> ''بہت سوچنے کے بعد میں نے طے کیا دونوں لڑکیوں کو علی گڑھ بھیج دوں۔ میرے وہاں بہت دوست بھی تھے اور اساتذہ بھی۔ سلطانہ (بیوی) نے میری اس رائے کی تائید نہیں کی مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔''(۶۱)

اختر الایمان کی جنسی اور ازدواجی زندگی کے بارے میں بات کریں تو ہم دیکھتے ہیں شادی سے پہلے انکے بہت سے ناکام معاشقے رہے تھے جن میں حسرت و یاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس پر یہ ستم کہ انکی شادی بھی انکی مرضی کے خلاف کر دی گئی تھی۔ جس کا خاتمہ آخر میں طلاق پر ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد انکی شادی انکی پسند کی لڑکی سے ہوئی لیکن لاشعور میں سابقہ شکست و محرومیوں کا کانٹا کہیں نہ کہیں چُبھا ہوا تھا۔ آئیں ابتدا میں انکی شادی کے جبر اور پھر اس کے نتیجے میں اُٹھنے والی ازدواجی کشمکش پر

نظر کرتے ہیں:

''ابا دلّی سے آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ میرا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے تو شادی کی تاریخ بڑھ جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ابا آئے اور یہ جاننے کے باوجود میرا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے شادی کی تیاری میں لگ گئے۔میرے اندر شادی کے خلاف بغاوت سی پیدا ہوگئی تھی۔مگر میں کچھ نہیں کرسکا۔شادی کے دن ہاتھ کا پلاسٹر نکال دیا گیا مگر ہاتھ ابھی تک سوجا ہوا تھا اس پر پٹی باندھ دی گئی......ہندوستان کی شادیوں کا جائزہ لیا جائے تو شاید ہی اتنی بے مزہ بے رنگ شادی کوئی دوسری نکلے جو میری تھی۔'' (۶۲)

انہیں ایک طرف سے قیصر کی جدائی کا غم ستا رہا تھا، دوسری طرف زبردستی کی گئی شادی کی بھڑاس دل میں سلگ رہی تھی، ان سب باتوں نے انہیں ایک طرح کی نفسیاتی اُلجھن سے دوچار کر دیا۔اس تناؤ سے وقتی فرار حاصل کرنے کے لیے انکی نظریں اپنی سالی پر مرتکز ہوئیں اور وہ ان سے ذہنی آسودگی محسوس کرنے لگے۔خودنوشت میں ان کے ابتدائی عشق،شادی کے لیے جبر اور اس کے بعد پھر سے قلبی میلان کی کشمکش کا مختصر خاکہ ذیل میں دئے جارہے اقتباس میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

''اگلے روز رسم کے مطابق دُلھن کو واپس میکے جانا تھا سب نے کہا تم بھی جاؤ اور دُلھن کو واپس لے کر آؤ......وہاں ایک لڑکی سے میری ملاقات ہوئی جو مجھے بہت اچھی لگی۔اس کا نام فرحت تھا......سُسرال میں بیوی غائب ہوگئی جب تک وہاں رہا نظر نہیں آئی۔فرحت پیش پیش تھی،معلوم ہوا رشتہ میں سالی ہوتی ہے......میں نے فرحت سے کہا ''سالی جی تمہاری بہن کہاں ہیں؟'' ''تمہاری شادی میرے ساتھ ہونی چاہئے تھی''......جن حالات میں یہ شادی ہوئی تھی۔وہ خوشگوار حالات نہیں تھے۔پس منظر میں قیصر تھی جو ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح آکر چلی گئی تھی اور پیش منظر میں ایک ایسی زندگی جو سراسر مبہم تھی ناپختہ حالات اور ایک ایسی بیوی جو کسی زاویے سے بھی نصف بہتر نہیں محسوس ہورہی تھی۔......اس (فرحت) کے جانے کے بعد میں ایک احساسِ زیاں میں مبتلا ہوگیا۔ایک تکون سی بن گئی میرے ذہن میں۔جس کے ایک سرے پر میں کھڑا تھا۔دوسرے سرے پر قیصر (سابقہ محبوبہ) اور تیسرے پر فرحت۔بار بار کوئی مجھے اندر سے کچوکے دے رہا تھا۔پوچھ رہا تھا۔اس بستی میں شادی ہونی تھی تو فرحت سے کیوں نہیں ہوئی؟......فرحت سے ملنے کی خواہش بار بار نجیبہ آباد لے کر آتی تھی اور سلمہ سے رفاقت نہ ہونے کے سبب واپس چلا جاتا

تھا، نتیجہ پڑھنا لکھنا خاک نہیں ہوا اور میں فیل ہو گیا۔'' (۶۳)

فرحت سے شادی ہونا محال تھی، قیصر کے ملنے کی بھی کوئی صورت نہیں تھی اور بیوی کے ساتھ زندگی گزارنا بھی انکے بس کا روگ نہیں تھا لہذا پھر سے اپنے ذہن کو انتشار سے بچانے کے لیے انہوں نے گھر بار چھوڑ دیا اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج میں آ گئے۔ کالج کے زمانے میں وقتی طور پر وہ کئی لڑکیوں میں دلچسپی لینے لگے لیکن ایک لڑکی سلطانہ انہیں بہت پسند آئی۔ آخر کار پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس دوسری لڑکی سے شادی کر لی لیکن دوسری شادی کے بعد بھی اختر الایمان کو تشفی بخش جنسی وازدواجی آسودگی نصیب نہیں ہوئی۔ انکا رشتہ پھر بھی کئی عورتوں سے مسلسل رہا جن میں بعض ان سے عمر میں بڑھی بھی تھیں۔ انکے اپنی عمر سے بڑی عورتوں کے ساتھ تعلقات اور کئی معاشقے رکھنے کے کئی ایک وجوہات ہو سکتے ہیں لیکن ایک نفسیاتی سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بچپن میں ایک ناکام و نامراد عاشق رہے ہیں جس کی وجہ سے ان میں انتقام وحسرت کی چنگاری کہیں لاشعور میں دہک رہی تھی۔ اس کے ساتھ دوسرا نفسیاتی پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید انکا لاشعور بڑھی عورت سے تعلق رکھنے میں ماں کی مامتا ڈھونڈتا ہو جس سے وہ بچپن میں محروم رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انکے یہاں جنس کے تعلق سے انتہا درجے کی ہوس ناکی نہیں ملتی۔ وہ بس محبت کے بھوکے لگتے ہیں، وہ صرف محبت پانا اور کرنا چاہتے ہیں۔

اختر الایمان کے جنس کے پہلو کو اگر ہم ایڈلر کے نظریہ احساس کمتری کے تناظر میں بھی دیکھنے کی کوشش کریں تو انکی شخصیت کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی۔ خودنوشت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنس کے معاملے میں وہ احساس کمتری میں نظر آتے ہیں، جسے وہ احساس برتری میں تعلقات کی کثرت رکھنے سے تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جوانی میں ایک نامرادو ناکام عاشق ثابت ہوئے تھے۔ ایڈلر کے نظریۂ کے مطابق نفسیاتی امراض کا سبب جنسی جبلت نہیں بلکہ وہ احساسِ کمتری ہوتی ہے جو شکست یا محرومی کے بعد جنم لیتی ہے۔ اختر الایمان میں یہی احساس کمتری نظر آتی ہے یعنی ان کی مرضی کے خلاف شادی اور چند ناکام معاشقوں نے ان کے اندر احساس کمتری اور محرومی کو جنم دیا تھا۔ جیسا کہ پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مصنف بچپن میں ماں باپ اور رشتہ داروں کی محبت سے بھی بہت حد تک محروم رہ چکے تھے لہذا اس کی تلافی کے لیے وہ کثرت سے تعلقات رکھ کر خود کو اور دُنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ''میں احساس کمتری سے

نجات اور عظمت وسطوت پا رہا ہوں''، لیکن ان میں جب کبھی اس احساسِ کمتری کا جذبہ زیادہ اُمڈ آتا ہے تو ایڈلر کے نظریے کے عین مطابق ہم ان میں ایسے موقعوں پر زندگی سے شدید مایوسی اور بیزاری کے آثار پاتے ہیں:

''مجھ پر ایک ایسا دور بھی آیا ہے کہ میں جینے سے بددل ہو گیا۔ کہیں کوئی روشنی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ سخت احساسِ محرومی کا شکار تھا۔ ان دنوں میں نے اپنے اندر کئی تبدیلیاں پیدا کرلیں۔ جن میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جنھیں اس وقت خرابیاں کہا جاسکتا تھا۔ مثلاً شراب نوشی شروع کردی اور اس درجہ کہ دن میں بھی پینے لگا۔''(۶۴)

انکی زندگی سے مایوسی و بیزاری اور ذہن میں شدید نفسیاتی کشمکش پر یہاں ایک اور مثال دیکھئے:

''ذہن پر ہر وقت ایک چڑ چڑاپن سوار رہتا ہے۔ میں اس احساس کو اپنانا نہیں چاہتا مگر جانے کیوں یہ بات ہر وقت دماغ پر سوار رہتی ہے کہ بیوی بچّے بے حس ہیں۔ انھیں میری تگ و دو کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ سوچتا ہوں مہاتما بدھ کی طرح دنیا کو چھوڑ کر چلا جاؤں مگر مہاتما بدھ کے سامنے تو ایک آدرش تھا۔ کوئی اُلجھا ہوا مسئلہ یا کوئی لگن انسان اور انسان کی زندگی سے متعلق تھا، میرے سامنے کیا ہے کنواں کھودنا اور پانی پینا۔''(۶۵)

ژاک لاکان کے نظریہ خواہش کی روشنی میں اختر الایمان میں بھی ہم عورتوں کے تئیں نہ ختم ہونے والی خواہش کو پاتے ہیں لیکن یہ خواہش شدید ہوس کا روپ اس لیے اختیار نہیں کرلیتی کیونکہ وہ مسلسل مقدر کی ستم ظریفیوں میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں جو انہیں سنبھلنے نہیں دیتیں۔ بہر حال اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے بے باک ہو کے اپنے کئی معاشقوں کا ذکر کیا ہے تاہم ان میں جوش کی طرح وہ ہوس نا کی نہیں ملتی۔ انہوں نے جب کبھی بھی عورت کا ذکر کیا ہے، احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہ عورتوں کے متعلق اپنی خودنوشت میں جس نیک بینی اور مجموعی نظریہ کا اظہار کرتے ہیں وہ یہ ہے:

''عورتوں سے باتیں کرتے وقت میرے ذہن میں جنس نہیں آتی ایک ذہنی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ میرا ہمیشہ سے خیال ہے۔ عورت زندگی میں توازن پیدا کرتی ہے''(۶۶)

''اس آباد خرابے میں'' کے مطالعہ سے یہ بات اوّل تا آخر دیکھنے میں ملتی ہے کہ مصنف نے بچپن سے آخری عمر تک سخت آلام و مصائب کا سامنا پے در پے کیا ہے۔ ان ہی ناموافق حالات اور آسائش سے دوری نے انہیں جنسی کج روی کے کیچڑ میں گرنے سے بچائے رکھا۔ علاوہ ازیں، جنس کے حوالے سے ہم

ایڈلر کے نظریے کے مطابق ان میں جنسی خواہش کے برخلاف قوت کے حصول کی خواہش کو ہی زیادہ غالب دیکھتے ہیں۔جس کی متعدد مثالیں خودنوشت میں موجود ملتی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال کو بطور نمونہ درج کیا جارہا ہے:

''خانہ آبادی بھی ہوگئی اور کام بھی مل گیا مگر میں خوش ہونے کی جگہ دھرم سنکٹ میں پڑ گیا۔ پروتما (فلم پرڈیوسر) چاہتی تھی میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں تا کہ اس کی فلم تیزی سے بن سکے اور ازدواجی زندگی کا تقاضا تھا میں زیادہ سے زیادہ وقت سلطانہ کے ساتھ گزاروں وہ ابھی دلہن ہی کہلانے کی منزل میں تھی مگر میں نے رسم اور جذبات پر ضرورت کو ترجیح دی''۔(٦٧)

اختر الایمان کی نفسیاتی کشمکش کے اثرات کو جہاں ہم انکی خودنوشت میں جگہ جگہ محسوس کرتے ہیں، وہیں ان کشمکشوں کے اثرات انکی شاعری میں بھی درآئے ہیں۔ چنانچہ جب ہم انکی شاعری کو نفسیاتی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو یہاں بھی کشمکش اور تذبذب کی کیفیت کے آثار کثرت کے ساتھ واضح صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کشمکش کے عالم میں دم بخود ہوکر رہ گئے ہیں۔ فراق گورکھپوری نے صحیح کہا تھا کہ اختر الایمان ایک گھائل آواز ہیں لیکن ظاہر سی بات ہے اس گھائل آواز کے پیچھے انکی گہری کشمکش چھپی ہے۔اب ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال اُبھر آئے کہ شاعری یا ادب کو بنیاد بنا کر کسی شخصیت کے بارے میں یقینی طور سے کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی ہے لیکن خودنوشت کا معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ یہاں سچائی کا عنصر دیگر اصناف کی بنسبت زیادہ غالب رہتا ہے۔اس لیے یہاں کافی حد تک شخصیت کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ کہ خودنوشت میں مرقوم واقعات کی مماثلت شاعری میں بیان کے گیے موضوعات سے جب میل کھاتے ہوں، تو اس تکرار سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوجاتی ہے کہ مصنف واقعتاً بہت سی نفسیاتی کشمکشوں میں مبتلا رہے ہیں۔اب آئیں اختصار کے ساتھ ان کشمکشوں کے اثرات ان کی شاعری میں ملاحظہ کرتے ہیں۔نمونے کے طور پر پہلے یہ بند دیکھیں:

ہزاروں باریوں ہوا کہ جب امید گئی
گلوں سے واسطہ ٹوٹا، خار اپنے رہے

گماں گزرنے لگا ہم کھڑے ہیں صحرا میں
فریب کھانے کی جا رہ گئی، نہ سپنے رہے
نظر اُٹھا کے کبھی دیکھ لیتے تھے اوپر
نہ جانے کون سے اعمال کی سزا ہے کہ آج
یہ واہمہ بھی گیا، سر پہ آسمان ہے کوئی

(بے چارگی)

اسی طرح یہ بند بھی انکی کشمکش کو اُجاگر کرتا ہے:

ہے مرکزِ نگاہ پر چٹان سی کھڑی ہوئی
ادھر چٹان سے پرے وسیع تر ہے تیرگی
اسے پھلانگ بھی گیا تو اس طرف خبر نہیں
عام خراب تر ملے نہ موت ہو نہ زندگی

(نقشِ پا)

ان نمونوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اختر الایمان کے قدم جیسے ڈھلان پر رُکے ہوئے ہیں وہ ایسی کشمکش کے عالم میں گرفتار ہیں کہ انہیں کہیں جائے اماں نہیں دکھتی۔ انکی اس درمیانی منزل کی درماندگی کی کیفیت پر وزیر آغا کے تاثرات بھی اس دعوے کی تائید و تصریح کرتے ہیں:

''وہ جگہ جہاں اختر الایمان رُکا ہے۔ دراصل ایک ایسا مقام ہے جس سے آگے بڑھیں تو نشیب کی لڑکھڑاہٹ وجود میں آ جائے اور پیچھے ہٹیں تو زندگی کے مظاہر سے لپٹنے کا میلان جنم لے۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں ہر فنکار اپنے ظرف کے مطابق ایک خاص ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بعض آگے بڑھ کر موت سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ بعض پیچھے ہٹ کر یادوں کا دامن تھام لیتے ہیں اور بعض اس مقام پر کھڑے ہو کر اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اختر الایمان نے ان میں سے کوئی طریق بھی اختیار نہیں کیا۔ وہ تو خطرے کو سامنے پا کر تذبذب کے عالم میں دم بخود ہو کر رہ گیا ہے اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ آگے بڑھے یا پیچھے کو ہٹ جائیں۔ اس کیفیت کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ شاعر موت کی مقناطیسی کشش کے سامنے قطعاً بے دست و پا ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اختر الایمان کے ہاں ایسا نہیں ہوا البتہ وہ ایک

نفسیاتی ادھیڑ بن میں ضرور گرفتار ہو گئے ہیں۔ یہ وہی کیفیت ہے جس میں شیکسپیئر کا کردار ہیملٹ اسیر ہوا تھا۔(To be or not to be) اختر الایمان کی بہترین نظمیں اسی کیفیت کی عکاس ہیں۔اس کے بعد شاعر نے مراجعت کر کے ذہن کی جس دوسری سطح کو اپنایا ہے وہ ایک عارضی اور ہنگامی فرار کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہر حال! موت کو سامنے پا کر اختر الایمان کے یہاں جو ایک خاص اور منفرد ردِ عمل وجود میں آیا ہے وہ تذبذب اور ادھیڑ بن ہی سے عبارت تھا۔''(۶۸)

محولہ بالا اقتباس سے بھی اس امر کی خوب توضیح ہوتی ہے کہ اختر الایمان نفسی اُلجھن اور کشمکش میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں وہ ایک طرف ماضی کی گھنگور سیاہی پاتے ہیں تو دوسری طرف مستقبل کی مخدوش صورتِ حال سے گھبراتے ہیں۔ نیز ان کے دل میں ایک معصوم حزن وملال کا گوشہ بھی نظر آتا ہے جس پر تحفظ کی دُھول نہیں پڑی ہے۔اس طرح کی صورتِ حال کی نظیریں ان کے ادب میں جا بجا ملتی ہیں۔ آخر میں انکی شاعری سے ایک اور بند کو انکی کشمکش بیان کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ بند بھی انکی سخت محرومی اور تذبذب کی صورت حال کو مزید روشن کرتا ہے:

سوا تمہارے مجھے کچھ نظر نہیں آتا
حیات نام ہے یادوں کا تلخ اور شیریں
بھلا کسی نے کبھی رنگ و بو کو پکڑا ہے
شفق کو قید میں رکھا، صبا کو بند کیا
ہر ایک لمحہ گریزاں ہے جیسے دشمن ہے
نہ تم ملو گی نہ میں، ہم بھی دونوں لمحے ہیں
وہ لمحے جا کے جو واپس کبھی نہیں آتے۔

(نظم۔ بنت لمحات)

آخر الکلام! اس بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لاشعور تک رسائی حاصل کرنے والی لا تعداد دبی ہوئی خواہشیں یا یادیں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مقام پر انسان کے اندر نفسیاتی کشمکش کو ضرور جنم دیتی ہیں، جس سے منفی اور مثبت دونوں طرح کے نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ اختر الایمان نے بھی جو محرو

میاں ابتدائی دور میں دیکھیں اور جو یادیں ان کے سینے کے اندر دفن تھیں، انکا اظہار زندگی کے مختلف مراحل پر کئی طریقوں سے ہوتا رہا۔ ایسے ہی تلخ وشیریں واقعات و تجربات اور اس سے پیدا شدہ کشمکش سے نبرد آزمائی سے ''اُس آباد خرابے'' کے مصنف کی ذات عبارت ہے، جسے سمجھنے کے لیے یہ خودنوشت بے حد مدد و معاون قرار دی جا سکتی ہے۔

حوالہ جات

(۱) صالحہ عابد حسین، سلسلۂ روز و شب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، اشاعت اول ۱۹۸۴، ص ۸، ۹

(۲) ایضاً، ص ۲۱، ۲۲

(۳) ایضاً، ص ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰

(۴) ایضاً، ص ۴۱۵

(۵) ایضاً، ص ۲۸۶

(۶) پروفیسر قمر رئیس، آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ، اُردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶

(۷) سلسلۂ روز و شب، ص ۱۶۸

(۸) ایضاً، ص ۱۴

(۹) ایضاً، ص ۴۱

(۱۰) ایضاً، ص ۲۲، ۲۳

(۱۱) ایضاً، ص ۴۰۳، ۴۰۴

(۱۲) ایضاً، ص ۲۷۲

(۱۳) ایضاً، ص ۲۸۰، ۲۸۱

(۱۴) ایضاً، ص ۳۰۶

(۱۵) ایضاً، ص ۱۱۵، ۱۱۶

(۱۶) ایضاً، ص ۱۱۷

(۱۷) ایضاً، ص ۱۱۹

(۱۸) ایضاً، ص ۱۶۹......۱۷۴

(۱۹) ایضاً،ص۲۲۱،۲۲۲

(۲۰) ایضاً،ص۲۴۸

(۲۱) ایضاً،ص۴۳۳

(۲۲) کشور ناہید، ''بری عورت کی کتھا''، ادیب پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۹۵ء، ص ۶۷

(۲۳) ایضاً،ص۱۰

(۲۴) روزنامہ دنیا، ای پیپر،

https:dunya.com.pk/index.php/special-feature/2015-10-08/13896

(۲۵) بُری عورت کی کتھا،ص۶۹

(۲۶) ایضاً،ص۷۰

(۲۷) ایضاً،ص۷۱

(۲۸) ایضاً،ص۲۹

(۲۹) ایضاً،ص۶

(۳۰) ایضاً،ص۳۲

(۳۱) ایضاً،ص۲۸

(۳۲) ایضاً،ص۱۸،۱۷

(۳۳) ایضاً،ص۲۳،۲۴

(۳۴) ایضاً،ص۳۹

(۳۵) ایضاً،ص۶

(۳۶) ایضاً،ص۱۷،۱۶

(۳۷) ایضاً،ص۱۹

(۳۸) ایضاً،ص۱۸

(۳۹) ایضاً،ص۱۷

(۴۰) ایضاً،ص۲۰

(۴۱) ایضاً،ص۶۵

(۴۲) ایضاً،ص۱۴۵

(۴۳) ایضاً،ص۱۷

(۴۴) ایضاً،ص۵۴،۵۵

(۴۵) ایضاً،ص۵۳

(۴۶) ایضاً،ص۲۷

(۴۷) ایضاً،ص۲۸

(۴۸) ایضاً،ص۹۵

(۴۹) ایضاً،ص۵۶

(۵۰) ایضاً،ص۲۰

(۵۱) ایضاً،ص۸۴

(۵۲) اختر الایمان،۳۱ آبادخرابے میں،اُردو اکادمی،دہلی،۱۹۹۹ء،ص۱۴

(۵۳) ایضاً،ص۱۴

(۵۴) ایضاً،ص۴۰

(۵۵) ایضاً،ص۴۷،۴۸

(۵۶) ایضاً،ص۴۸

(۵۷) ایضاً،ص۶۳،۶۴

(۵۸) ایضاً،ص۶۴

(۵۹) ایضاً،ص۳۵

(۶۰) ایضاً،ص۱۴۰

(۶۱) ایضاً،ص۲۳۰

(۶۲) ایضاً،ص۶۴

(۶۳) ایضاً،ص۶۵،۶۶،۶۷

(۶۴) ایضاً، ص۷۲

(۶۵) ایضاً، ص۱۷۵

(۶۶) ایضاً، ص۷۷

(۶۷) ایضاً، ص۲۲۷

(۶۸) وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔علی گڑھ ۱۹۷۴، ص۴۷۹